

# میوہ ہمیشہ

علامہ نصیر الدین نصیر ہونزائی

# میوه بہشت

یکے از تصنیفات

علامہ نصیر الدین نصیر ہونزائی

نسخہ

خانہ حکمت  
ادارہ عارف

میوۂ بہشت کی

# فہرست مضامین

| صفحہ | عنوان                  | شمار |
|------|------------------------|------|
| ۵    | سُخْنِبَاکِ اَاز       | ۱    |
| ۱۴   | تخلیق در تخلیق         | ۲    |
| ۲۳   | عبادت میں مخفی خزانے   | ۳    |
| ۳۱   | خوفِ خدا اور خوفِ بیجا | ۴    |
| ۴۰   | حکمتِ حدیث             | ۵    |
| ۵۰   | رُوح اور حضرت آدمؑ     | ۶    |
| ۵۹   | رُوحِ اسلام            | ۷    |
| ۶۹   | رُوح اور سائنس         | ۸    |
| ۸۶   | معراج اور معارج        | ۹    |
| ۹۵   | سُنَّتِ اَلہی          | ۱۰   |
| ۱۰۳  | تطہیر و تزکیہ - ۱      | ۱۱   |
| ۱۱۲  | تطہیر و تزکیہ - ۲      | ۱۲   |

|     |                            |    |
|-----|----------------------------|----|
| ۱۲۱ | خانہٴ خُدا۔ خانہٴ جماعت۔ ۱ | ۱۳ |
| ۱۳۲ | خانہٴ خُدا۔ خانہٴ جماعت۔ ۲ | ۱۴ |
| ۱۴۱ | تاویلی سوالات              | ۱۵ |
| ۱۴۸ | سلمانِ فارسی               | ۱۶ |
| ۱۴۵ | چند اعلیٰ سوالات           | ۱۷ |
| ۱۴۹ | اشاراتی زبان               | ۱۸ |
| ۱۷۸ | سورۃٴ هُمَزَة (۱-۹)        | ۱۹ |
| ۱۸۱ | کَلْبَائِے دَانَش          | ۲۰ |
| ۱۹۰ | دوانتہائی عظیم فرشتے       | ۲۱ |
| ۱۹۵ | موت کی عظیم حکمتیں         | ۲۲ |

## سخنہائے آغاز

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِکَتَهُ یصلُّونَ عَلٰی النَّبِیِّ  
 یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا صَلُّوا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِیْمًا (۵۶)

اے خداوند بخشنده و مهربان! تو اپنی رحمت بے نہایت سے ہم جیسے عاجز  
 و ناتوان بندوں کو ایک ایسی عالی ہمتی عنایت فرما کہ جس سے ہم خاکساران  
 تیرے برگزیدہ اور محبوب رسول اور آنحضرت کی آل اطہار پر جیسا کہ چاہیے  
 بامعرفت صلوات پڑھیں: اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَآلِ  
 مُحَمَّدٍ۔

اے وہ ذاتِ پاک و کیلتا! جو مکان و لامکان سے برتر بھی ہے، اے  
 ہماری رگِ جان سے نزدیک تر بھی، تیرے حضورِ اقدس میں جملہ حاجات  
 ظاہری و باطنی پیش ہیں، اے خدائے احد و صمد! اے سُبُوْح و قُدُّوس  
 ہر بندۂ مومن ہمیشہ یہی چاہتا ہے کہ جی بھر کر تیری حمد و ثنا اور تعریف و  
 توصیف کرتا رہے، لیکن اے پادشاہِ بے پُخُون و بے خِشَال! تو جانتا ہے  
 اور کتنی حالِ تجھ سے پوشیدہ نہیں، کہ یہ امرِ عظیم نہ صرف عقلِ جزوی کی وسیع

سے سخت مشکل ہے، بلکہ الفاظ و معانی کی تنگ دامانی کے سبب سے بھی یہ کام بدرجہ انتہا دشوار ہے، اس لئے **یا اللہ!** تو اپنی ہدایت الٰہی سے اس غریب و بیچارہ دل کو سوز و گداز کا ستر چھتمہ بنا لے، تاکہ یہ بندہ مسکین طفل خیر خوار کی طرح ہر حاجت و طلب کے بہانے سے خوب خوب آنسو بہا سکے، تاکہ وسیلہ رُبُوبیت اور دایۃ عاطفیت (یعنی رحمتِ خداوندی) میری اس گریہ و زاری کی گوناگون ترجمانیاں اور تشریحیں کرے، جس طرح کوئی جسمانی مادرِ مہربان اپنے لختِ جگر کے بہتے ہوتے آنسوؤں کی طرح طرح سے تعبیریں کرتی ہے، مگر اس سے آسمانی نوازشات کا موازنہ ہرگز نہیں ہو سکتا، کہ ظاہری ماں کی ممتا قطرہ کم مقدار کی طرح ہے، اور تیری رحمت (مہر و نوازش) بکھرے پایاں ہے۔

یہ بہت ہی پیاری کتاب جو **میسوۃ بہشت** کے

**کتاب کا نام**

کے پُر مغز اسم سے موسوم ہے، چند اسم اور مفید مقالے کا مجموعہ ہے، جو مختلف مواقع پر لکھے گئے تھے، جن کے آخر میں تاریخ وغیرہ درج ہے، تاکہ ناظرین و قارئین کو ہر مقالے کی اصل صورت اور کتاب کی نوعیت بخوبی معلوم ہو سکے، اگر یہ بعض ایسی کتابوں میں اس اصول پر عمل اس لئے نہیں کیا گیا ہے کہ بار بار مصنف کا نام آنا عجیب لگتا تھا۔ تاہم مستقبل کے لئے تاریخی معلومات کے پیش نظر یہی طریق کار بہتر ہے کہ جو کتاب نخطوط اور مقالوں پر مبنی ہو، اس کے اجزاء کو اصل صورت میں پیش کیا جاتے، تاکہ تحریروں کی ترتیب اور ارتقائی شکل کا تعین ہو، نیز

اگر کسی سکار نے خاندانِ حکمت اور احادِ ارفعِ عارف پر تحقیق (سیرچ) کرنے کا ارادہ کر لیا تو وہ البتہ اپنے کام کے لئے ان چیزوں سے تاجِ تقدیر کرے گا۔

لفظ "میوۃ بہشت" کا مفہوم قرآنی حکمت میں بڑا جامع جو ارفع ہے، جس کی وجہ ظاہر ہے، کہ خداوندِ علیم و حکیم نے دنیائے مادّی کی تمام تر غذاؤں میں سے میوہ (پھل) کو منتخب فرمایا، تاکہ اس سے رُوح اور عقل کی اعلیٰ نعمتوں کی تشبیہ و تمثیل دی جاتے، اس انتخاب کا سبب یقیناً یہی ہے کہ میوہ یعنی پھل (بزیانِ قرآنِ حکیم، شکر، فاکھہ، غیر) کی مثال میں رُوحی اور عقلی جو ارفع کے اشارات موجود ہیں، جن کو صرف اہل دانش ہی سمجھ سکتے ہیں۔

جس طرح ہر دنیاوی میوہ اپنے درخت کا مکمل جوہرِ خلاصہ اور نچوڑ ہوا کرتا ہے، یعنی اس میں تمام شجر کی ہر ہر قوت بصورتِ جوہر موجود ہوتی ہے، یہاں تک کہ اس میں اپنی قسم کا ایک دوسرا درخت اگانے کی صلاحیت بھی پوشیدہ ہے، اسی طرح بہشتِ برین کا رُوحانی، علمی، اور عقلی میوہ ہے، جو درختِ کائنات و موجودات کا جوہر (گوہر.....) ہے، جس کی رنگینی دیدہ دل کے لئے، خوشبوِ مشامِ جان کے لئے، اور ذائقہ رُوح و عقل کے لئے بیحد مرغوب و پسندیدہ ہے۔

گلشن یا گلزار وہ احاطہ ہے، جہاں پھول کھلتے ہیں، اور باغ اُس چار دیواری کا نام ہے، جس میں میوہ دار درخت ہوتے ہیں، مگر

روحانی بہشت کی یہ کیفیت ہے کہ وہ نہ صرف گلشن درگلشن اور باغ درباغ ہے بلکہ وہ گلشن درباغ اور باغ درگلشن بھی ہے، کیونکہ وہ جہان لطیف اور عالم امر ہے، جس میں معجزۂ امرکن کی کار فرمائی ہے، اور چیزیں چشم زدن میں ظہور پذیر ہوتی رہتی ہیں، بہ ہر حال اگر ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو عالم شخصیت کی جنت میں پہلے تو روحانیت کے پھول ہی پھول نظر آتے ہیں، اور پھر علم و حکمت کے پھل ہی پھل۔

کوئی بھی ہوشمند جو قرآن پاک کے ظاہر سے واقف و آگاہ ہو، یہ سوال کر سکتا ہے کہ قرآن مقدس میں بہشت کے پھولوں کا ایسا تذکرہ کہاں ہے، جس کے حوالے سے آپ نے یہ ذکر کیا ہو؟ میں جواب کے طور پر یوں عرض کروں گا کہ قرآن حکیم میں بزبانِ حکمت سب کچھ مذکور ہے، چنانچہ قرآن کریم میں جہاں جہاں لفظ جنت، روضہ، حدیقہ اور بہشت کا کوئی بھی نام آیا ہے، اس میں پھولوں کا ذکر پوشیدہ ہے، نیز جن آیات کریمہ میں جنت کے درختوں اور میوؤں کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے، ان میں بھی یہ بات ہے، کیونکہ جنت درباغ، پھل اور پھولوں کا تصور پیش کرتی ہے، اور شجر و ثمر پھول کے بغیر نہیں، اس کے علاوہ ایک بڑا اہم نکتہ یہ بھی یاد رہے کہ جس طرح حوا اس ظاہر میں سب سے اترتے ہیں بصارت ہے، اسی طرح حوا اس باطن میں بصیرت (روح کی بینائی) افضل ہے، جس کے لئے جنت میں گونا گون لطف مناظر (دیکھنے کی چیزیں) موجود ہیں (آئۃ ۴۳) جن میں لطیف پھول بھی شامل ہیں۔



قرآن حکیم میں کئی ایسی آیات ہیں، جن کا مجموعی مفہوم یہ ہے کہ جب آسمان سے بارش برستی ہے تو مردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے، وہ یہ کہ زمین کا آباد حصہ سرسبز اور گل و گلزار بن جاتا ہے، جس کی تاویل یہ ہے کہ جب نورِ نبوت و امامت کے آسمان سے قلوبِ مومنین کی زمین پر حقیقی علم کی بارش برستی ہے، تو اس کے نتیجے میں انکے دل باغباتے بہشت کے انتہائی خوب صورت مناظر کو پیش کرتے ہیں، چنانچہ مشاہدہ باطن میں جہاں پھول نظر آتے ہیں، وہ علم کی علامت ہیں، اور وہاں جیسے پھل سامنے آتے ہیں، وہ حکمت کی نشانی ہیں۔

اگر قرآنی حکمت میں غور سے دیکھا جائے تو یقیناً

### ہر چیز کا میوہ

معلوم ہو جائے گا کہ عالمِ روحانیت میں ہر چیز کا پھول اور پھل ہے، اور کوئی چیز اس قانونِ کل سے باہر نہیں (۲۸) اور روحانی سلطنت کو جنت (باغ و گلشن) کے اسم سے موسوم کرنے کے معنی بھی یہی ہیں، چنانچہ ہر چیز کی حسین و جمیل روحانی صورت گویا گل ہے، ہر شے کا ذرّہ روح میوہ ہے، اور اس کی حکمت مغز ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ عالمِ خیال بمرتبہ نورانیت بہشت کا وہ گلشن ہے، جس میں کائنات و موجودات کی ہر چیز صبیغۃ اللہ (۱۳۸) کے رنگ میں یا تو پھول ہے یا پھول کی طرح رنگین ہے، عالمِ ذرّہ باغِ میوہ دار ہے، جہاں تمام چیزوں کی رُو حیں موجود ہیں، اور وہ ثمرات یعنی میوے کہلاتی ہیں، اور کنزِ عقل وہ خزینہ الہی ہے، جس

میں ہر میوہ بہشت کا مغزِ حکمت موجود ہے۔

اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ جنت میں کیا کیا نعمتیں ہیں؟ یا پوچھے کہ اس میں کتنی قسم کی نعمتیں ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہو گا کہ بہشت کی بیشمار نعمتیں ایک اعتبار سے دو قسم کی ہیں، پہلی قسم ان نعمتوں کی ہے جن کو انسان پہچانتا ہے، اس لئے ان کی خواہش کرتا ہے، دوسری نعمتیں وہ ہیں، جن کا آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا (۳۵)، دوسرے اعتبار سے جنت کی چیزیں عقلی، روحانی، اور لطیف جسمانی قسم کی ہیں، ان کی بہت سی ذیلی قسمیں ہیں، اس بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ بہشت اور اس کی نعمتوں کی معرفت ضروری ہے، تاکہ صحیح خواہش پیدا ہو سکے، کیونکہ اگر کوئی آدمی رب العزت کی اعلیٰ سے اعلیٰ نعمتوں کا علم نہیں رکھتا اور خواہش و طلب پیدا نہیں کرتا ہے تو قانونِ خزاں (۱۵)، قانونِ معرفت (۲۶)، اور قانونِ چاہت (۳۵) کے بموجب مہاجرین اس کو نہیں ملیں گی۔

کائنات و موجودات کی ہر چیز درخت کی طرح کام کرتی ہے، اور اُس سے اپنی نوعیت کا ایک میوہ پیدا ہو جاتا ہے، آسمان کو دیکھتے، کیا سورج، چاند، سیارے، اور ستارے، اس شجر کے پھل نہیں ہیں؟ پہاڑ جہاں درخت ہے، وہاں اس کے میوے جو اہر اور معدنیات ہیں، اگر سمندر درخت نہ ہوتا، تو گوہر (موتی)، اس کے ثمرات نہ ہوتے، ایک اور حکمت یہ ہے کہ زمین

درخت ہے، اور اس کے میوے نباتات ہیں، عالم نبات درخت ہے، جس کا پھل حیوان کہلاتا ہے، درخت حیوان کا تر انسان ہے، اور دنیائے انسانیت کا میوہ عقل و جان انسانِ کامل ہے، اب ایک اور نکتہ سُن لیجئے: ایک شریف انسان عہد طفولیت میں غنیمتِ ناشگفتہ جیسا محبوب اور پیارا ہوتا ہے، نوجوانی میں اس کی شخصیت گلِ رعنا کی طرح جاذبِ نظر اور پرکشش ہوتی ہے، اور جب وہ عمر کی پختگی کو پہنچتا ہے، تو اس وقت وہ عقل و دانش کے اعتبار سے ایک ایسے پاکیزہ و پختہ پھل کے مشابہ ہوتا ہے جو خوشبو، عمدہ ذائقہ، اور پُر قوت مغز کے لحاظ سے بہترین ہوتا ہے، پس ان مثالوں سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ ہر چیز کا پھل ہے، اور نظامِ کائنات دراصل نظامِ ثمرات ہے، اور بہشت کار از اسی میں مضمحل ہے۔

اگر اس علمی خدمت کو جہالت و نادانی کے خلاف **شکر گزاری** ایک جہاد قرار دیا جائے تو اس صورت میں یوں کہنا حقیقت پر مبنی ہو گا کہ خُدا تعالیٰ اور اس کے رسولِ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نورانی تائید و نصرتِ امامِ زمان صلوات اللہ علیہ کے وسیلے سے حاصل ہو سکتی ہے، اور اس میں "خَانۃِ حِکْمَت" اور "اَحْزَابِ عَارِف" کے بہت سے جان نثار مجاہدین سینہ سپر ہو گئے ہیں، آپ انکے سخی میں اس طرح دُعا کریں کہ: "خُداوند! امامِ عالی مقام کے مجملہ مُریدوں اور تمام پاک ادا روں کے صدقے کے طور پر انکو کامیابی اور فتحِ مندی سے ہمکنار کر دینا! آمین!!"

ہمارے دونوں نامور پریذیڈنٹز فتح علی حبیب اور محمد عبد العزیز اس علمی جہاد میں صنفِ اول کے مجاہد ہیں یہ صاحبان ہر متعلقہ کام کو، خواہ بڑا ہو یا چھوٹا، بہ نفس نفیس انجام دیتے ہیں، وہ چراغِ امامت کے پرولنے اور حقیقی علم کے شیدائی ہیں، ان کی دوستی میوہ بہشت کی طرح سید شیرین اور دلنواز ہے، کیونکہ وہ اخلاق و ایمان کی خوبیوں سے آراستہ ہیں، میں دونوں اداروں کے ہر عملدار اور ہر ممبر کو فرشتہ بحد قوت سمجھتا ہوں، کہ ان تمام حضرات نے بل کر شرق و مغرب میں ایک علمی انقلاب کو جاری و ساری کر دیا ہے۔

میں اس وقت بھی مشرق و مغرب میں پھیلے ہوئے دوستوں اور رفقاء کے کار کو یاد کرتا ہوں، میرے دل و دماغ اور تصور میں زیادہ سے زیادہ وہی عزیزان چھاتے ہوئے ہیں جنہوں نے اپنی گرانقدر خدمات سے ہمارے اداروں کو کامیاب بنا دیا ہے، میں ان سب کا شکر گزار اور ممنون ہوں اگر یہ بات درست ہے کہ ہر رُوح لا تعداد ذرات کا مجموعہ ہوا کرتی ہے، تو یہ انتہائی خوشی کی بات ہے، سو میں چاہوں گا کہ میری رُوح کے ذرات جس کثرت سے بھی ہوں، وہ سب کے سب ہمارے محسنین کے حق میں شکر گزار اور دعا گو رہیں! اور اُن سے قربان بھی ہو جائیں! آمین!!

نوٹ: صدر فتح علی حبیب اور صدر محمد عبد العزیز کا مشورہ ہے کہ اس جیسے مقالوں اور کتابوں کو بار بار پڑھا

جائے، تاکہ قرآنی بھیدوں اور رُوحانی معلومات کے  
ذخیرے میں زبردست اضافہ ہو سکے۔

تاکپائے اہل ایمان

نصیر الدین نصیر ہونزائی

۱۶۔ جون ۱۹۸۵ء

# تخلیق در تخلیق

آفرینش در آفرینش کہیں یا تخلیق در تخلیق یا پیدائش میں پیدائش، بہر حال اس کا مطلب سبحان اللہ تعالیٰ کا سلسلہ فعل، جس میں وہ مطلقاً ابتداء و انتہا کے بغیر ہمیشہ ایک چیز سے دوسری چیز بنانے کے معنی میں پیدائش کے اندر پیدائش کرتا رہتا ہے، اور ہر دو دشمنوں کے نزدیک اس حقیقت کی تحقیق و تصدیق اُس وقت ہو سکتی ہے جبکہ وہ عالم شخصی کی تخلیق کو قرآن اور نور امامت کی روشنی میں دیکھتا ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں ارشاد ہوا ہے:-

لَمَّا خَلَقَ اللَّهُ الْعَقْلَ اسْتَنْطَقَهُ ثُمَّ قَالَ لَهُ: أَوَّلُ مَا خَلَقْتُ خَلْقًا هُوَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْكَ وَجَلَانِي مَا خَلَقْتُ خَلْقًا هُوَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْكَ وَلَا أَعْظَمُكَ إِلَّا فِي مَنْ أَحَبُّتُ، أَمَّا إِنِّي إِيَّاكَ أَمَرْتُ وَإِيَّاكَ أُنْهَيْتُ، وَإِيَّاكَ أَعَاقِبْتُ، وَإِيَّاكَ أُنْتَبِئُ۔  
حضرت ابو جعفر (یعنی حضرت امام باقر) سے روایت ہے کہ: جب اللہ تعالیٰ نے عقل کو پیدا کیا تو وہ حکم خدا بولنے لگی، پھر خدا نے اسے فرمایا:

آگے آ، تودہ آگے آئی، پھر اسے فرمایا: سچے جا، تودہ سمجھے گئی، پھر ارشاد ہوا:  
میری عزت و جلال کی قسم! کہ میں نے کوئی ایسی خلق پیدا نہیں کیا ہے، جو میرے  
مقابلے میں مجھ کو زیادہ محبوب ہو، اور بات یہ ہے کہ میں تجھ کو صرف ایسے  
شخص میں کامل اور مکمل کر دیتا ہوں جس سے میں محبت کرتا ہوں، ہاں میرے  
امر و نہی کا خطاب ہمیشہ تجھ ہی سے ہوتا رہے گا، اور عذاب و ثواب کا  
تعلق بھی تجھ ہی سے ہوگا۔

اس عالی شان اور پُر حکمت حدیث سے بیک وقت چند حقیقتیں  
نکھر نکھر کر سامنے آتی ہیں:

۱۔ (مقامِ رُوحانیت کے درجہ اعلیٰ پر عقل گفتگو کرتی ہے، مگر زبانِ حکمت  
سے۔

۲۔ عقل نے ترقی و تنزیل کا ایک بہت بڑا دور دیکھا ہے۔

۳۔ عقل خدا کے نزدیک محبوب ترین مخلوق ہے۔

۴۔ کامل اور مکمل عقل اُس شخص میں پیدا ہوتی ہے جو خدا کو پہچانے

اور اللہ اُس سے محبت کرے۔

۵۔ خداوندی اوامر و نواہی کا اطلاق صرف اور صرف عقل ہی

پر ہوتا ہے۔

۶۔ سب سے بڑا عذاب بھی اور سب سے عظیم ثواب بھی عقلی

صورت میں ہیں۔

آپ سب اس نورانی تعلیم میں سنجوئی دیکھتے ہیں کہ یہ عالم شخصی کی

تخلیق کا ذکر ہے، جو ایک دائمی سلسلہ ہے، جس کو یہاں تخلیق و تخلیق کہا گیا ہے، جس کی مثال انبیاء و ائمہ علیہم السلام ہیں، چنانچہ جب باری تعالیٰ ایک کامل انسان کے بعد دوسرے کامل انسان کو پیدا کرتا ہے تو وہ تخلیق و تخلیق کہتا ہے اس کے معنی یہ ہوتے کہ خدا تعالیٰ یکے بعد دیگرے شخصی دنیا میں بنا تا رہتا ہے، اور ان میں سے ہر ایک میں وہی ساری باتیں واقع ہوتی ہیں، جو مذکورہ حدیث میں ہیں یہی وہ ہے کہ قرآن حکیم سب لوگوں کو اپنے آپ (عالم شخصی) میں سفر کرنے کی دعوت دیتا ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا ہے:-

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ  
ثُمَّ اللَّهُ يُنشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ (۲۰) ان سے کہو کہ زمین میں  
چلو پھرو اور دیکھو کہ اس نے کس طرح خلق کی ابتدا کی، پھر اللہ بار دیگر  
بھی پیدا کرتا ہے۔ اگر ہم اس پر حکمت حکم کا مطلب اس ظاہری اور باہری  
زمین کی سیر و سیاحت تک محدود کریں، تو اس سے چند سوالات پیدا ہو سکتے  
ہیں، مثال کے طور پر:-

۱۔ اگر مانا جائے کہ ”الارض“ سے یہاں سیارہ زمین اور خلق“  
سے عالم ظاہر مراد ہے، تو اس زمین پر چلنے پھرنے سے یہ راز یا اس  
سوال کا جواب کہ: ”خدا نے کس طرح تخلیق کائنات کی ابتداء کی؟“  
کیسے معلوم ہوگا؟

۲۔ اگر کہا جائے کہ یہ حکم عالم انسان کے پہلوتے جسمانی کے  
بارے میں ہے، تو اس صورت میں سیارہ زمین کی سیر یا سفر سے خلقت آدم



کے بھید کیونکر کھل سکتے ہیں؟ اور کس طرح یقینِ کامل حاصل ہو سکتا ہے کہ  
خداوند تعالیٰ بار دیگر بھی پیدا کرے گا؟

اس بیان سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ زمین میں سیر، سے اپنی  
ذات (یعنی عالمِ شخصی) میں سفر مُراد ہے، جس کا ذکر قرآن حکیم میں ۷۷:۱۲-۱۳  
بار کے علاوہ بھی ہے، کوئی شک نہیں کہ انسانی ذات کی شناخت سے کائنات  
و موجودات کی شناخت حاصل ہو جاتی ہے، اور اسی کے نتیجے میں حضرت  
ربِّ عورت کی معرفت ہے۔

تخلیق در تخلیق کی ایک اور نمایاں مثال یہ ہے: یَخْلُقُكُمْ فِي  
بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ خَلْقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِي ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ  
(۳۹/۶) خدائے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ میں ایک قسم کی پیدائش کے بعد دوسری  
قسم کی پیدائش سے تین تاریکیوں میں پیدا کرتا ہے۔ یعنی جب انسان بچا  
نُطفہ اپنی ماں کی سچے دانی میں ہوتا ہے، تو اُس وقت وہ جسمی، رُوحی، اور عقلی  
تین قسم کی تاریکیوں میں ہوتا ہے، ایسی کیفیت میں اللہ تعالیٰ اس کی تخلیق  
کے اندر تخلیق کرتے ہوئے اسے جسمانی کمال کی طرف لے جاتا ہے جیسے  
وہ جو ہر خاک (سُلالہ) سے نُطفہ بناتا ہے، اُس سے نُوْنِ بَسْتہ (علقہ)  
بناتا ہے، اس سے گوشت کی بوٹی (مضغہ) اس سے ہڈیاں (عظام)  
پھر ہڈیوں پر گوشت (لحم) چڑھاتا ہے، اور پھر خلقِ آخر بناتا ہے (۲۳/۱۳-۱۴)  
مذکورہ بالا آیت کریمہ بزبانِ حکمت انسانوں سے کہہ رہی ہے کہ تم  
جب اپنی ماؤں کے پیٹ میں تھے اُس وقت جسم، رُوح، اور عقل

تینوں کے انوار سے خالی ہو کر آگئے تھے، یہ بات بالکل ایسی ہے، جیسے حضرت آدم علیہ السلام کا فردوس برین سے فرش زمین پر بہبوط ہوا تھا، اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو انسان پر جبکہ شکم مادر میں ہوتا ہے ایک ساتھ تین تاریکیوں کا اطلاق نہ ہوتا، کیونکہ قرآنی الفاظ واقعیت و حقیقت کے معنی لئے بغیر نہیں ہوتے۔

انسان کی جس حالت کا نام موت ہے، اور جس کیفیت کو حیات کہا جاتا ہے اور ان دونوں سے جتنی چیزیں متعلق ہیں، وہ سب کی سب بل کر ایک مکمل دائرے کو تشکیل دیتی ہیں، ظاہر ہے کہ دائرے کی حقیقت کوئی ابتدا و انتہا نہیں، یعنی اس کا کوئی سرانہیں، لیکن آپ بہاں سے کوئی کام شروع کریں گے وہی جگہ مجازاً ابتدا کہلانے گی، کیونکہ اگر حقیقت کی کوئی تعمیر کرنی ہے تو اس کے لئے مجاز سے کام لیا جاتا ہے، اور اس کے بغیر براہ راست حقیقت کو سمجھ لینا ممکن نہیں۔

آپ اس آیت کریمہ میں خوب غور کریں: **الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ (۳۲)** جو چیز بھی اُس نے بنائی خوب ہی بنائی اور اُس نے انسان کی تخلیق کی ابتداء گارے سے کی۔ اس آیت مقدسہ کی تاویل کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ اس دنیا میں اچھی اور بُری دونوں قسم کی چیزیں ہیں، اور وہ تاویل اس طرح ہے: ”خدا وہ ہے جس نے تخلیق درتخلیق کرتے ہوئے عالم خلق کی ہر چیز کو عالم امر کی طرف بلند کیا، اور وہاں اسے ایک بہترین شکل دے دی، اور حقیقی انسان کی پیدائش

درجہ مومن سے شروع کی، پس آپ اس ارشاد میں بغور دیکھ سکتے ہیں کہ ہر آدم سے قبل مومنین موجود تھے۔

ہر کامل انسان اپنی ذات میں ایک مکمل لطیف کائنات (علم شخصی) ہوا کرتا ہے، اور یہ ایک سلسلہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا، جس میں باعتبار شخصیت ہر ایسے عالم کی ابتداء سب سے جدا اور الگ ہے، بالفاظ دیگر یہ ابتداء دراصل انفرادی ہے اجتماعی نہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ کلی طور پر کوئی ابتداء و انتہا نہیں، اور یہ بہت بڑا راز ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کی بادشاہی میں دو قسم کی چیزیں ہوا کرتی ہیں ایک ہے شیء مذکور، کہ خدا نے اس کا ذکر فرمایا ہے، اور دوسری ہے شیء غیر مذکور، جس کا اُس نے کچھ ذکر نہیں فرمایا ہے، یہ دونوں مثالیں انسان ہی کی ہیں، جیسا کہ سورۃ دہر کے شروع (۲۶) میں ارشاد فرمایا گیا ہے: **هَلْ أَتَى عَلَى الْإِنْسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُورًا** (۲۶) کیا انسان پر دہر (زمانِ ناگزیر) میں سے ایک وقت آیا ہے جس میں وہ کوئی مذکور چیز نہ تھا (یعنی وہ تھا، مگر غیر مذکور) اس کا اشارہ یہ ہے کہ اگرچہ وہ وقت ہنوز نہیں آیا ہے، لیکن ضرور آنے والا ہے، اس ربّانی تعلیم سے تخلیق در تخلیق کے تصور پر روشنی پڑتی ہے، اور واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ تخلیق کا خدا فی فعل قدیم ہے، جس کی کوئی ابتداء و انتہا نہیں۔

مذکور اشیاء بھی اور غیر مذکور اشیاء بھی اچھی اور بُری دو دو

قسم کی ہیں، چنانچہ غیر مذکور چیزوں میں بُری وہ ہیں، جو ایک اعتبار سے کالعدم قرار دی گئی ہیں، مثلاً کافر کو "لَا شَيْءٌ" قرار دینا، یا مردہ ٹھہرانا، اور اچھی چیزیں وہ ہیں جو بے مثال ہونے کی وجہ سے غیر مذکور کہلاتی ہیں، جیسے عارف کامل کو "فنا فی اللہ" کا درجہ دے کر خدائی میں اس کا ذکر نہ کرنا، حالانکہ کافر بھی اور عارف بھی موجود ہیں، پس دہر کی مقاربت و مناسبت سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں انسان کا غیر مذکور چیز ہونا قابلِ رستائش بات ہے، کیونکہ اس حال میں انسان کی حقیقت ہمیشہ اصل سے واصل رہنے کا ثبوت مل جاتا ہے۔

جب اللہ تعالیٰ جو واحد و قہار (۱۴) ہے، عالمِ شخصی میں نقلاً لاکر بکھرے ہوئے مکان و زمان کو دستِ قدرت میں سمیٹ لیتا ہے (۳۹/۴۶) اور حقیقتِ حقائق میں مجملہ حقیقتوں کا مظاہرہ فرماتا ہے تو اس میں نہ صرف دہر ہی سامنے ہوتا ہے، بلکہ ازل اور ابد کا تصور بھی ایک ہی ہوتا ہے، کیونکہ وہاں جو سب سے بنیادی، سب سے آخری اور سب سے عظیم خزانہ ہے، اس میں تمام حقائق و معارف محدود و موجود ہیں، یہ گنجِ اصل و اساس کی حیثیت اس لئے رکھتا ہے کہ اسی سے کائناتِ ظاہر و باطن کی ہر ہر چیز پیدا کی گئی ہے، اور آخری اس معنی میں ہے کہ مجملہ اشیائے مکانی و زمانی کا پنچوڑ یعنی جوہر ہی ہے، اس خزانہ بے بہا کا ایک خاص نام ملکِ خدا (یعنی خدا کی بادشاہی) ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:-

تَبْرِكُ الَّذِي بِيَدِهِ الْمَلِكُ وَهُوَ عَلِيُّ كُلِّ

شیء قدیر (۱) وہ (خدا) نہایت بابرکت ہے جس کے ہاتھ میں سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس میں بطریق اشارہ یہ فرمایا گیا ہے کہ رُوحانیت کے جس مقام پر خدا کے ہاتھ میں ملک و ملکوت (یعنی گنج گوہر) ہے، وہیں تمام علمی و عرفانی برکتیں اور قُدرتیں مرکوز ہو جاتی ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ نُورِ عقل جو حقیقتِ حقائق ہے، اُس میں ہر اعلیٰ سے اعلیٰ اور ہر مشکل سے مشکل تصور کی نمائندگی موجود ہے، اس لئے کہ وہ قلمِ قُدرت ہے، کتابِ ممکنون، سرچشمہ نُور، کوہِ طور، حجرِ مکرم اور معدنِ علم و حکمت ہے۔

تخلیق در تخلیق کی ایک اور روشن مثال یہ ہے کہ جب اللہ تبارک و تعالیٰ کے حکم سے کوئی کامل انسان پیدا ہو جاتا ہے، پھر وقت آنے پر اس کا رُوحانی جنم ہوتا ہے، پھر وہ جیتے جی رُوحانی موت کے مرحلے سے گزر جاتا ہے، اور آخر میں جب اس کا انبعاث ہو جاتا ہے، تو تب وہ اس آیتِ کریمہ کا مصداق بن جاتا ہے، وہ ارشاد یہ ہے: **رَأَيْتَ يَبْنَؤُ الْخَلْقِ نَشْئِمَ يَعِيدُكَ** (نہ) بیشک پیدائش کی ابتداء وہی کرتا ہے پھر وہی اس کا اعادہ کرتا ہے۔ یہاں انسانِ کامل کا ذکر اس لئے ضروری ہوا کہ صرف وہی مُبارک ہستی ظاہراً و باطناً خداوند تعالیٰ کی آخری اور مکمل تخلیق کا نمونہ ہے، جیسے خدا تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو کما حقہ پیدا کیا، اور سلسلہٴ انبیاء و ائمہ علیہم السلام میں اپنی پاک و پُر حکمت عادت رُسُلتِ  $\frac{1}{2}$ ،  $\frac{1}{8}$ ، کو دہرا تارا۔

آپ یہ کلیدی حکمت ہرگز نہ بھولیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے جیسے صفاتی نام ہیں اور ان ناموں کے مطابق جیسا اس کا کام ہے، وہ سب کچھ اس کی سُنتِ عالیہ میں داخل ہے، اور خُدا کی پاک سنت وہ ہے، جو اس کے خاص بندوں یعنی کامل انسانوں میں ہوگزی ہے اور وہ کسی تبدیلی کے بغیر ہمیشہ جاری ہے (۳۳، ۳۵) پس اس کے معنی یہ ہوتے کہ خُداوندِ تعالیٰ کے فعلِ تخلیق کی نہ کوئی ابتداء ہے اور نہ کوئی انتہا، بلکہ وہ ہمیشہ تخلیق درِ تخلیق کرتا رہتا ہے اور اسی فعلِ قُدرت سے خُدائی رحمت و علم کے سمندر ہر وقت موجزن رہتے ہیں۔

ادارہ عارف

خانہ حکمت

ذرہ خاک:

فصیر الدین نصیر ہونزاتی

۲۷- جنوری ۱۹۸۵ء

## عبادت میں مخفی خزانے

قرآن حکیم میں لفظ "عبادت" کے مختلف صیغوں کا مجموعہ ۲۷۵ ہے، ان الفاظ سے متعلق آیاتِ کریمہ میں براہِ راست بھی اور بالواسطہ بھی عبادت و بندگی کا ذکر فرمایا گیا ہے، صلوٰۃ، سجدہ، ذکر، تسبیح، دُعا وغیرہ جیسے لفظوں میں جس طرح اللہ تعالیٰ کی بندگی کا بیان آیا ہے، وہ اس کے علاوہ ہے، غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کا موضوع جتنا اہم ہے اتنا وسیع و عمیق بھی ہے، کیونکہ بہتات اور انسانوں کی تخلیق کا مقصد عبادت ہی ہے، جیسا کہ پروردگارِ عالم کا فرمان ہے :-

۱- وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ

(۵۱/۶) اور میں نے جنوں اور آدمیوں کو اسی غرض سے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔ عبادت کی ارتقائی منزلیں ہوا کرتی ہیں، چنانچہ وہ شروع شروع میں معمولی نوعیت کی ہوتی ہے، مگر یہ رفتہ رفتہ اپنے عروج اور درجہ کمال پر جا پہنچتی ہے، جبکہ ہر طرح کے شرک و شبہہ سے پاک اور خدا شناسی کے نور سے متور ہوتی ہے، پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اور اُمّہ، ہڈی صلوات اللہ علیہم نے ہمیشہ ایسی کامیاب عبادت و بندگی کی عملی تعلیم دی ہے، اور اسی کو پیغمبرانہ یا عارفانہ عبادت کہتے ہیں، اور آنحضرتؐ کی حقیقی پیروی یعنی اُسوۃ حسنہ (۲۱) اسی معنی میں ہے۔

۲۔ قرآن حکیم میں جگہ جگہ عبادت کے ذکر کے ساتھ ساتھ معرفتِ توحید کے بھی قابلِ فہم اشارے موجود ہیں، جیسے مذکورہ بالا آیہ مقدّسہ کا واضح اشارہ یہ ہے کہ جن وانس کا کوئی فرد معبود نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ مخلوق ہے خالق نہیں، وہ عبادت کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے، اسے عِبَدٌ اور عابد ہونا ہے، اور معبود ہونا نہیں، اور اس کو خدا کی معرفت اُس وقت حاصل ہوگی، جبکہ وہ اپنی روحانی تخلیق کا مشاہدہ اور مطالعہ کر لیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس آیہ مبارکہ میں حقیقی عبادت سے پہلے روحانی تخلیق کا ذکر ہے، کیونکہ خَلَقْتُ (میں نے پیدا کیا) کے اس خُدائی فعل میں تخلیق کے تمام جسمانی اور روحانی مراحل کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

۳۔ خدا شناسی اور بندگی (عبادت) ایک ایسا ضروری اور مشکل امر ہے کہ لوگ نہ تو اس کی اہمیت کو جانتے تھے اور نہ ہی اسے بجالا سکتے تھے، لہذا خداوندِ عالم نے اس سلسلے میں لوگوں کو تعلیم دینے کی خاطر پیغمبروں کو مبعوث فرمایا، جیسا کہ ارشاد ہے: وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ (۱۶۶) اور ہم نے توہر اُمت میں ایک (نہ ایک) رسول اس بات کے لئے ضرور بھیجا کہ لوگو خدا کی عبادت کرو اور بت (کی عبادت)



سے بچے رہو۔ طاغوت کے معنی سرکش، شیطان، اور بت کے درمیان مشترک ہیں، پھر چنانچہ اس آیتِ کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ تم بالآخر خدا شناسی اور علمِ توحید کی روشنی میں عبادت کرو، تاکہ تم سرکش شیطان اور بت کی پُرسش سے نجات پاؤ گے۔

۴۔ شیطان سے بچ کر مومن خدا نے عبادت کرنے کے لئے لوگوں سے جیسا کہ فرمایا گیا ہے، اگر انھوں نے اس کے مطابق عمل نہ کیا تو اس کی پُرسش اس طرح ہوگی (ترجمہ آیتِ کریمہ): اے اولادِ آدم! کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا وہ یقیناً تمہارا اکلِ کھلا دشمن ہے اور یہ کہ صرف میری عبادت کرنا یہی سیدھی راہ ہے (۹۰-۹۱) آپ بخوبی جانتے ہیں کہ دنیا میں کوئی ایسا گروہ یا فرد نہیں ہو سکتا، جو شیطان کو جان پہچان کر اس کی عبادت کرتا ہو، مگر بات یہ ہے کہ بہالت و نادانی کی وجہ سے اکثر لوگ راہِ حق سے ہٹ کر شیطان کے پیچھے چلتے ہیں، اور یہی شیطان کی پیروی درحقیقت شیطان کی عبادت کہلاتی ہے۔

۵۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا تعالیٰ کی ہر اطاعت عبادت ہے، اور اللہ کی وہ اطاعت بھی یقیناً عبادت ہے، جو رسول اور صاحبِ امر کے توسط سے بجالاتی جاتی ہے، جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے: اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور پیغمبر کی اطاعت کرو اور صاحبِ امر کی اطاعت کرو جو تم میں سے ہیں (۵۹) اس ربّانی تعلیم کی روشنی میں دیکھنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ رسولِ اکرم اور امامِ زمانہ

کی فرمانبرداری دو طرح سے خُدا سے واحد کی عبادت قرار پاتی ہے، اول یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مُحکم دیا کہ تم رسول اور امر والوں کی اطاعت کرو، اب اس خُدائی مُحکم کی تعمیل عبادت ہوگی، دُوم یہ کہ اولوالامر کی اطاعت رسول کی اطاعت ہے، رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے، اور اللہ کی اطاعت عبادت ہے۔

۶۔ عبادت کے دوران چہرہ جان کو خُدا تعالیٰ کی طرف قائم رکھنے اور دین کو شرک کی آمیزش سے خالص و پاک کر کے اسی کو پکارنے کے لئے یوں مُحکم دیا گیا ہے: **واقيموا وجوهكم عند محفلِ مسجدٍ وادعوا لِمخلصين له الدين (۲۹)** اور یہ کہ تم ہر عبادت کے وقت اپنی توجہ قائم رکھا کرو اور اسی کو پکارو دین کو اُس کے لئے خاص رکھ کر۔

۷۔ اللہ تعالیٰ کی جو زمین بے پناہ وسیع ہے، وہ زمین رُوحانیت ہے (۹۷، ۵۶، ۱۰، ۳۹) چنانچہ ارشاد ہے: **يلعبادى الذين امنوا ان ارضى واسعة فايأتى فاعبدون (۵۶)** اے میرے خاص بندو جو کما حقہ ایمان لاتے ہو یقیناً میری زمین رُوحانیت بہت وسیع ہے سو خالص میری ہی عبادت کرو (تاکہ تم کو اُس زمین میں خلافت عطا کی جائے)۔ جیسا کہ ارشاد ہوا ہے: **تم مسلمان و مومنین** میں سے جن لوگوں نے ایمان لایا جیسا کہ اس کا حق ہے اور اچھے اچھے کام کئے ان سے خُدا نے وعدہ کیا ہے کہ ان کو رُوحانی زمین میں ضرور خلیفہ بنائے گا

جس طرح اُن لوگوں کو خلیفہ بنایا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں (۲۵) مذکورہ دونوں آیتوں میں ایسے مومنین کا ذکر فرمایا گیا ہے، جو خدا شناس اور موحّد بننے کی بدولت اللہ تعالیٰ کے انعامات کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

۸۔ خدا شناسی، توحید، اور کسی آمیزش کے بغیر خالص عبادت کا ایک بڑا اہم قرآنی موضوع ”اخلاص“ ہے، جس کا مطلب ہے تصویر توحید کو ہر قسم کے شرک کی آمیزش سے خالص اور پاک و پاکیزہ کرنا، اس عظیم الشان موضوع سے متعلق پُر حکمت الفاظ میں سے ایک لفظ ”مُخْلِصِينَ“ ہے، جو قرآن کریم میں اٹھ بار آیا ہے، جس کے وسیع تر معنی ہیں خدا کے ایسے بندے جو معرفت اور خالص عبادت کے وسیلے سے برگزیدہ کہتے گئے ہیں، جیسا کہ ارشاد ہے :-

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَا تُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ —  
 (الاعبادك منهم المخلصين) (۸۲-۸۳) اہلسنی نے کہا  
 تیری عزت کی قسم، میں ان سب لوگوں کو بہکا کر رہوں گا، بجز تیرے اُن بندوں  
 کے جنہیں تو نے خالص کر لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے خالص و برگزیدہ بندے  
 سب سے پہلے انبیاء و ائمہ علیہم السلام ہیں اور پھر ان کی پیروی کرنے  
 والے مومنین ہیں، جو دامن امامت کے نیچے ہر طرح سے محفوظ و سلامت  
 ہیں، اور نور ہدایت کی روشنی میں جادہ مستقیم پر گامزن ہیں۔ لہذا شیطان  
 ان کو گمراہ نہیں کر سکتا۔

۹۔ سورۃ صافات میں فرمایا گیا ہے : ..... مگر خدا کے برگزیدہ

بندے (اہل نجات ہیں)، ان کے واسطے دانستہ رزق ہے، ہر قسم کے میوے اور وہ لوگ بڑی عزت سے نعمت کے باغوں میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے تخت نشین ہوں گے (۴۰-۳۷)، اس نورانی تعلیم میں بھی اخلاص کے شاندار نتائج کا ذکر ہے، یعنی خدا شناس اور موحّد لوگوں کو بہشت کی لازوال وابدی نعمتیں حاصل ہوں گی، اس سلسلے میں "رزق معلوم" یعنی ایسا رزق (رزوی) جو پہلے سے جاننا پہچانا ہوا ہے، بڑا اہم مسئلہ ہے، کیونکہ اگر ہم اس سے مادی قسم کی نعمت مراد لیتے ہیں، تو پھر اس خیال سے ایک عجیب نتیجہ نکلے گا، وہ یہ کہ بہشت کی نعمتیں صرف ایسے لوگوں کو ملیں گی جو اس دُنیا میں مادی طور بڑی آسائش میں رہتے ہوں، کیونکہ ظاہری نعمتوں کو وہی لوگ بہتر جانتے ہیں، لیکن ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ حقیقی نعمت ہے جو عقل کے لئے ہے، اور جو رُوح کے لئے ہے، اور یہی وہ رزق ہے جو اہل حقیقت کو دُنیا ہی سے معلوم ہے، اگرچہ دُنیا میں یہ نعمت جُزوی طور پر ہے اور آخرت میں مُکلی طور پر۔

رزق معلوم عبادت کی پباشنی ہے، ثمرۂ عشق مولا ہے، اور نورانی علم، اور اس سے یہ سوال اُٹھتا ہے کہ آیا بہشت میں اہل بہشت عبادت کرتے ہیں؟ اس کا جواب اثبات میں ہے، مگر وہاں عبادت بڑی آسانی، نورانیت، زبردست لذت اور کشفِ امرار کے ساتھ ہوگی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

(وہ زمین رُوحانیت میں منصبِ خلافت پر فائز ہو جانے کے

ساتھ میری خالص عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گے (۲۴/۵۵) یہاں شرک کا مطلب شرکِ کھفی ہے، یعنی عبادت میں غیرِ خدا کے خیال یا دوسرے کو دل میں آنے دینا، جیسے سورہ عنکبوت (۲۹/۴۵) میں مجھ اہل ایمان کے بارے میں مثال دی گئی ہے کہ وہ لوگ جب کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اللہ کو کسی شرک کے بغیر پکارتے ہیں، اور جب ان کو خدا نجات دے کر خشکی کی طرف لے آتا ہے، تو پھر وہ فوراً ہی شرک کرنے لگتے ہیں (۲۹/۴۵) پھر پانچمے شرک جو خیالاتِ باطل کی شکل میں ہے، جو بہت سے مومنین میں بھی ہو سکتا ہے، جس سے عبادت کو ہر بار نقصان پہنچتا ہے وہ اہل جنت کے دل میں نہیں ہوگا، لہذا وہ لوگ بہشت میں ہر قسم کے شرک سے خالص عبادت کریں گے۔

۱۰۔ بہشت کی عبادت یقیناً معجزاتی ہے، جس کا نمونہ اس دنیا میں پیغمبرانہ اور اولیائی عبادت ہے، جیسا کہ قرآن پاک کا حکم ہے: حقیقت تم لوگوں کے لئے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ تھا، ہر اس شخص کیلئے جو اللہ اور روزِ آخر (یعنی امامؑ) سے اُمید وابستہ کرتا ہو اور کثرت سے ذکرِ الہی کرے (۲۱/۳۳) اس خُدائی تعلیم کا واضح مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدا، رسولؐ، اور صاحبِ امرؑ کی اطاعت کرتے ہوئے دائم الذکر ہو جاتے ہیں، اُن پر پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نمونہ عمل کا روشن ہو جانا یقینی ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو آنحضرتؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کی دعوت نہ دی جاتی۔

۱۱۔ کوئی شک نہیں کہ شرکِ جلی اور شرکِ نجفی سے پاک عبادت میں نجفی خزانے ہوا کرتے ہیں، جن میں جیسے لعل و گہر ہوتے ہیں، ان کی قدومتِ روحانی، عقلی، علمی، اور عرفانی ہوتی ہے، اور یہاں یہ بھی یاد رہے کہ خُدا تعالیٰ، رسولِ پاکؐ، اور امامِ برحقؑ کُنہائے نجفی ہیں۔

۱۲۔ معرفت اور عبادت کے درجات ایک دوسرے سے ایسے ہیں، اور معرفت کا دوسرا نام یقین ہے، پُتنا نچہ یقین یعنی معرفت کی وجہ سے عبادت کے تین بڑے مرحلے ہیں، عبادتِ بمرتبہ علم یقین، عبادتِ بمرتبہ عین یقین، اور عبادتِ بمرتبہ حق یقین، اور اسی طرح عبادتِ مرحلہ آخر تک ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا ہے: اور اپنے رب کی بندگی کرتے رہو یہاں تک کہ حق یقین (کی منزل) آئے (۱۵/۹۹) یہ مُکَلَّفانہ عبادت کی آخری حد ہے، مگر جہاں یہ میوۃٴ بہشت کی حیثیت سے ہے، وہاں اس سے ہمیشہ ہمیشہ نوردوسرور حاصل ہوتا رہتا ہے۔

ادارۃ عارف

خاندانِ حکمت

فصیح حقیر

۲۸۔ دسمبر ۱۹۸۴ء

## خوفِ خدا (و) خوفِ بے جا

خوفِ ذی حیات مخلوق کی ایک صلاحیت ہے جو حیوان میں خودِ حفاظتی کی غرض سے ہے، مگر انسان میں اس کے ہونے کا خاص مقصد خدا ہی سے ڈرنا ہے، چنانچہ اگر انسانی خوف عملاً اسی مقصدِ اعلیٰ کے مطابق ہے تو بجا ہے، ورنہ بیجا رہے موقع، نامناسب ہے، جیسے سورۃ احزاب (۳۳) میں فرمایا گیا ہے کہ حضرت انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے تھے، کیونکہ خالق و مالک وہی ہے اور دوسرے سب مخلوق و مملوک ہیں۔

جو خوفِ جانوروں میں ہوتا ہے، اس کی عقلی اور علمی ترقی ناممکن ہے، کیونکہ جانور عقل جیسی روشنی سے محروم ہیں، اس لئے وہ جب بھی ڈرتے ہیں تو قوتِ واہمہ کے زیر اثر ڈرتے ہیں، مگر جو خوفِ انسان میں ہے وہ عقل کی ہم سایگی کی وجہ سے ترقی پذیر ہے، لہذا یہاں اس کا معیار بلند سے بلند تر ہو سکتا ہے، جس کی ایک مثال یہ ہے ایک چھوٹا سا بچہ شروع شروع میں غیر موجود وہی چیزوں کے نام سے ڈرتا ہے، لیکن وقت کے

ساتھ جیسی جیسی اس کو تعلیم ملتی رہتی ہے، اس کے مطابق خوف پہلے سے کہیں زیادہ درست کام کرنے لگتا ہے، یہی حال دین کے معاملے میں بھی کہ کہ کامل انسانوں کو چھوڑ کر باقی سب لوگ خوفِ خدا کے سلسلے میں بچوں کی طرح ہیں، اور یہی سبب ہے کہ قرآنِ حکیم تمام لوگوں کو خدا سے ڈرنے کی تعلیم دیتا ہے اور تاکید کرتا ہے کہ اللہ سے ڈرا کریں جیسا کہ بحقیقت اُس سے ڈرنا چاہئے، چنانچہ ارشاد فرمایا گیا ہے :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ (۱۲۰)

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسا کہ اُس سے ڈرنے کا حق ہے۔ اس حکم میں دو اہم مفہوم ہیں، اول یہ کہ کسی دوسرے سے نہیں بلکہ صرف خدا ہی سے ڈرنا، دوسرا یہ کہ خدا سے اس طرح ڈرنا، جس طرح کہ حقیقت میں اُس سے ڈرنے کی کیفیت ہے، اور اس بلند ترین معیار کے بائے میں ارشاد ہوا ہے :-

إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (۲۸) سوائے

اس کے نہیں کہ خدا کے بندوں میں سے علم والے ہی اُس سے ڈرتے ہیں۔ بقول حضرت امام جعفر الصادق علیہ السلام علماء سے ائمہ و طاہرین مراد ہیں، کیونکہ یہی حضرات نورِ علم کی روشنی میں بحقیقت اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں، اور بدرجہ اعلیٰ خوفِ خدا کی صفت سے متصف ہیں، یعنی تقویٰ (خوفِ خدا) انسانِ کامل کے اوصافِ کمال میں سے ہے، جو اس کی ذات میں برتہِ علمِ لدنی موجود ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ تقویٰ کا معیار



اعلیٰ حقیقی علم ہے۔

اگرچہ لفظ خوف کا اطلاق حضراتِ انبیاء و ائمہ علیہم السلام، اور عوام الناس کے علاوہ حیوانوں پر بھی ہو جاتا ہے، لیکن جیسا کہ اوپر بتایا گیا اس میں آسمان زمین کا فرق ہے، کیونکہ خوف کے بہت سے درجات ہیں، جن میں سب سے اوپر صرف خدا ہی کا خوف ہے، اور اس میں دنیاوی خوف و ہراس کے برعکس حقیقی امن و سکون کی غیر فانی دولت موجود ہے، کیونکہ "خدا سے ڈرنا" دراصل خدا کو یاد کرنا ہے، اور خدا کی یاد سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے (۱۳/۲۸)

دانشمندوں پر یہ حقیقت روشن ہے کہ خوفِ خدا میں علم و حکمت کے خزانے پوشیدہ ہیں، اور خوفِ دنیا میں مایوسی اور لاپرواہی کے سوا کچھ بھی نہیں، اللہ تعالیٰ کے خوف کی بدولت انسان کی زندگی رحمتوں اور برکتوں سے مملو ہو جاتی ہے، اور اگر کوئی شخص بادشاہِ حقیقی سے نہیں ڈرتا، تو اس کی یہ سزا مقرر ہے کہ وہ ہمیشہ خوفِ غیر میں مبتلا رہتا ہے اور اس کی عمر تلخیوں میں گزرتی ہے۔

یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ خوفِ الہی اور خوفِ دنیاوی کیفیت، تاثیر اور نتیجہ کے اعتبار سے ایک جیسے ہوں، اور خاص کر اُس خوفِ خدا کی بات کریں، جو اللہ کے دوستوں کے دل میں ہوتا ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا ہے: **الَّذِينَ اَوْلِيَاءُ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ** (۱۲/۶۲) یاد رکھو خدا کے دوستوں پر نہ کوئی خوف ہے اور

نہ کوئی غم۔ اللہ تعالیٰ کے دوستوں میں سب سے اول انبیاء و ائمہ صلوات اللہ علیہم ہیں، جن کے مبارک دلوں میں جس طرح خوفِ خدا یا تقویٰ ہوا کرتا ہے، وہ اگر ظاہری اور دنیاوی خوف جیسا ہوتا، تو پروردگارِ عالم مذکورہ آیتِ مبارکہ میں انکی ذاتِ شریف سے ایسے خوف و غم کی نفی نہ فرماتا، اس وقت دلیل سے یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ خوفِ مولا اور خوفِ دنیا ایک دوسرے کے برعکس ہیں، کیونکہ جب خدا بے مثل ہے تو اس سے ڈرنا کسی مخلوق سے ڈرنے کی طرح کیونکر ہو سکتا ہے۔

اب یہاں یہ سوال کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جب انسان میں درخت، حیوان، انسان تینوں کی رُو میں جمع ہیں، تو پھر بتائیے کہ دنیاوی خوف کس طرح رُو میں ہے، اور خدائی خوف کس رُو میں ہے؟ اس کا یقینی جواب یہ ہے کہ نباتات میں خوف و ہراس کی کوئی علامت نہیں، مگر حیوانات میں خوف موجود ہے، لہذا ظاہری اور جسمانی خوف کا سبب رُو حیوانی ہے، اور اب رہا خدا کا خوف تو اس کا وسیلہ عقل ہے، جو رُو انسانی کا شعلہ ہے، اسی لئے قرآن حکیم نے فرمایا کہ خوفِ خدا کا خاص تعلق ربّانی عالموں سے ہے (۲۸/۳۵)

قرآن پاک نے یہ بھی بتا دیا کہ خوفِ سبحا شیطان کا حربہ ہے، جیسا کہ فرمانِ خداوندی ہے: سوائے اس کے نہیں کہ یہ شیطان ہے جو اپنے دوستوں سے تم کو ڈراتا ہے (۳۵/۱) اس میں کوئی سوال نہیں کہ یہ خوف نفسِ حیوانی میں ہے، یا شیطان سے؟ جبکہ شیطان نفسِ امارہ کے توسط

سے کام کرتا ہے، یا یوں کہا جائے کہ شیطان کا ایک بھیس نفیس حیوانی ہے۔

خدا تے بزرگ و بڑے نے اپنی عزیز کتاب میں جگہ جگہ مسلمان و مومنین کو یہ ہدایت دی ہے کہ وہ دشمنانِ اسلام کی کثرتِ ظاہری سے ہرگز خائف نہ ہو جائیں، جیسا کہ وہ جیلِ شانہ، عالی ہمت اور با بصیرت مومنین کی ترجمانی کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے: **حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ** (۳۳، ۱) ہم کو خدا تعالیٰ کافی ہے اور وہی سب کام سپرد کرنے کے لئے اچھا ہے۔

”خوف بے جا“ جیسے مرض کی قرآنی دوا ایک تو خدا کی یاد ہے جو کثرت سے ہونی چاہیے، اور دوسری حقیقی علم کی روشنی ہے، جس سے اس بیماری کا مستقل علاج ہو جاتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کے ذکر سے جتنی شیطان بھاگ جاتا ہے، اور علم یقین سے انسی شیطان شکست کھاتا ہے، جس طرح شیطان کے پتھر اوڑھے پھرنے کے لئے خدا تعالیٰ کے قُرب و حضور میں جانے کی تعلیم دی گئی ہے، جس کی تاویل ہے امامِ زمان صلوات اللہ علیہ و سلامہ کے نورانی علم میں خود کو محفوظ کر لینا۔

ارشادِ خداوندی ہے: **وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقِصْ لَهُ شَيْطٰنًا فَمُوَلَّهُ**، قرین (۳۳، ۶۳) اور جو شخص اللہ کی یاد سے اندھا بن جاتے ہم اس کے لئے ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں سو وہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔ امامِ اقدس و اطہر خدا تعالیٰ کا زندہ اسمِ اعظم اور نورانیت سے بھرپور ذکرِ پاک ہیں، کہ آیت ہی کے وسیلے سے یادِ الہی کا نور حاصل ہو جاتا ہے، اور شیطان کے چنگل سے

سے مومنین کو چھٹکارا مل جاتا ہے، کیونکہ امام زمان علیہ السلام بمرتبہ علی وقت علم و حکمت کے باب دروازہ ہوا کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خوفِ خدا یعنی تقویٰ کے ظاہر اوباطناً کئی مدارج ہیں، پھرنا پھر یہ مقام رُوحانیت اور درجہ عقل پر علمی ظہورات و معجزات کی شکل میں ہے، جیسے سورہ فتح (۲۹) میں ہے کہ خدا تعالیٰ نے ”کلمہ تقویٰ“ مومنین سے وابستہ لازم کر دیا، سو تقویٰ کا کلمہ جو ایک بہت بڑا اسم ہے وہ رُوحانیت کا ایک علمی اور عملی معجزہ بھی ہے اور خود کار ذکر الہی بھی ہے، اور ان تمام معنوں میں اللہ تعالیٰ اپنے اس احسانِ عظیم کا ذکر فرماتا ہے کہ اُس نے کچھ مومنین کو کلمہ تقویٰ کا رُوحانی معجزہ دکھایا، جس میں تطہیر و تزکیہ کا ایک عذر ایسی راز پوشیدہ ہے۔ پروردگار عالم کا پُر حکمت ارشاد ہے: اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر نازل کرتے تو (اے مخاطب) تو اس کو دیکھتا کہ خدا کے خوف سے دب جاتا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا، اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سوچیں (۲۱) جب اللہ جل شانہ نے طور پر تجلی فرمائی تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا (۳۳) یہ تجلی خالی از معنی نہ تھی، بلکہ وہ بصورتِ نور آسمانی کتاب تھی، یعنی توراہ، اور یہ انتہائی عظیم واقعہ دو دفعہ پیش آیا، پہلی بار کوہِ روح پر، اور دوسری بار کوہِ عقل پر، اور خوفِ خدا کے یہی معجزے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رُوحانیت میں بھی ہوئے کہ پہلے خداوند عالم نے حضور اکرمؐ کے کوہِ روح پر تجلی فرمائی، جس میں قرآن

پاک کار و حافی ظہور ہوا، اس کے بعد خدائے برتر نے آپ کے کوہِ عقل پر تجلی کی، اور وہاں نورِ عقل میں قرآنِ حکیم کے ظہورات ہوئے، دونوں پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گئے تھے۔

پہاڑ کی کئی تاویلیں ہیں، ان میں سے ایک تاویل کوہِ رُوح ہے، اور دوسری کوہِ عقل، ان دونوں کے ریزہ ریزہ ہو جانے میں فرق ہے، کیونکہ رُوح کے بیک وقت لاتعداد ذرات ہیں، مگر عقل نمونہ وحدت ہے، لہذا وہ عالم شخصی میں صرف ایک ہی گہر ہے، تاہم جس طرح یکے بعد دیگرے اس کے علمی ظہورات کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اس کے پیشِ نظر وہ بھی بے شمار عقلی ذرات کی نمائندگی کرتا ہے۔

یہ جو کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے دوبارہ تجلی فرمائی تھی، اس کا ثبوت رُوح اور عقل کے دو پہاڑ ہیں، نیز یہ ہے کہ ذاتِ واحد کے سوا جو کچھ ہے، وہ سب سے پہلے دوئی رکھتا ہے، چنانچہ اگر مانا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی بہت سی تجلیات ہیں، تو اھولاً یہ کہنا پڑے گا کہ اساسی تجلیاں دو ہیں، اور یہ بھی یاد رہے کہ سب سے پہلے قانونِ وحدت ہے، اس کے بعد قانونِ تشبیہ (دوئی) اور آخر میں قانونِ کثرت ہے، توحید کا تصور مسلمہ ہے، اور کثرت بھی عیاں ہے، لہذا قانونِ دوئی کے بارے میں قرآنِ حکیم میں دیکھئے :-

ار حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی رُوحانیت میں نہ صرف جانور بلکہ جملہ اشیاء کی قسموں میں سے جفت جفت یعنی دو دوئی لگی تھیں

۲۔ خالق برحق نے کُل چیزوں کے دو دو جوڑے بنائے ہیں، اور کوئی

چیز اس قانون سے باہر نہیں (۵۱، ۳۶، ۳۶)

۳۔ بہشت کے سب پھلوں کے جوڑے جوڑے ہیں، اور کوئی پھل

ایکلا نہیں (۵۲، ۱۳)

۴۔ یہ بنیادی اور آخری حقائق دو دو ہیں: عرش و کرسی، قلم و لوح

عقل و کُل، نفس و کُل، آدم و حوا، آخرت و دنیا، آسمان و زمین، تیسر و شتر، ناطق و اساس، امام و حجت، پدر و مادر، دن رات، عقل و روح، وغیرہ وغیرہ۔

قرآن کریم تین چیزوں کی تعلیم ایک ہی شان سے اور ایک ہی نتیجہ پر

دیتا ہے: بلا شرکت غیرے صرف خدا ہی کی عبادت کرنا (۱، ۲۹، ۲۹) صرف خدا

ہی سے مدد کے لئے درخواست کرنا (۱، ۱) اور صرف اسی ڈرنا (۲، ۲، ۲)

(۵۱، ۱۶) اس کی وجہ یہ ہے کہ استعانت (خدا سے مانگنا) جزو عبادت ہے

اسی طرح اللہ سے ڈرنا شرط عبادت بھی ہے اور عبادت بھی، بلکہ یوں

کہنا چاہیے کہ خوفِ خدا تو ہر عبادت کی جان ہے، جیسا کہ اس فرمان

خداوندی سے ظاہر ہے: **وَ اِذْ كُرِّرْنَا فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا**

**وَ خِيفَةً وَ رُونَ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ**

**وَ الْاَصَالِ وَ لَاتُكِنُّ مِنَ الْغُفْلِينَ** (۲۰، ۵) اور اپنے رب

کو اپنی جان میں یاد کر عاجزی کے ساتھ اور خوف کے ساتھ اور کرم آواز

کے ساتھ صبح اور شام اور غافلوں سے مت ہونا۔ اس پر حکمت آیت

میں ذکر و عبادت کے اسرارِ عظیم کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

اس موضوع کے سلسلے میں شاید یہ سوال پیدا ہوگا کہ جب حضرت ابراہیمؑ کے پاس کچھ فرشتے آگئے، تو آپ نے دل ہی دل میں ایک خوف محسوس کیا (۱۱)۔ حضرت موسیٰؑ کئی مواقع پر ڈر گئے (۲۸، ۲۸، ۲۸، ۲۸، ۲۸) اور حضرت داؤدؑ کو بھی فرشتوں سے خوف ہوا (۲۲)۔ اس میں کیا راز ہے، جبکہ اللہ کے دوستوں کو ماسواء اللہ سے نہیں ڈرنا ہے؟

جواب: (الف) مذکورہ پیغمبروں کی ان مثالوں میں دہائی معجزات کی عظمت و جلالت سے خوفزدہ ہونے کا ذکر ہے، اور یہ دنیاوی خوف ہرگز نہیں۔

(ب) انبیاء و ائمتہ علیہم السلام کی عملی زندگی لوگوں کے عرف و ارتقا کا نمونہ و پیروی ہو کر رہی ہے، چنانچہ حکمت و مصلحت یہی تھی کہ وہ حضرات شروع شروع میں ایک طرح سے ڈر جائیں، اور اللہ ان میں سے ہر ایک سے فرمائے کہ: لَا تَخَفْ = نہ ڈر، تو پھر اس حکم کے بعد اولیاء اللہ (۱۲) دنیاوی خوف سے بالاتر ہو جاتے ہیں، اور اگر یہ بات نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ کے حکیمانہ ناموں میں سے ایک نامِ حِی الْمَعَارِج (سیرتھیوں والا) نہ ہوتا، اور یاد رہے کہ خدا کی سیرتھیوں انبیاء و ائمتہ علیہم السلام کی صورت میں ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ پہلے تو ہادی برحق خود ارتقا کی سیرتھی زمین بزمین چڑھتا ہے، اور خدا کی سیرتھی بن جاتا ہے پھر دوسروں کو اسی طرح چڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔

نصیر الدین نصیر ہونزائی

## حکمتِ حدیث

ار حضرت امام جعفر الصادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضورِ اقدس میں آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ میرے حق میں دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے بہشت میں داخل کر دے، رسول اکرم نے اُس آدمی سے فرمایا کہ دیکھو میں تمہارے لئے دعا کروں گا اور تم سجدوں کی کثرت سے اس میں میری مدد کرو۔ اس حدیثِ شریف سے جہاں ایک طرف کثرتِ سجدوں کی فضیلت ظاہر ہو جاتی ہے، وہاں دوسری جانب یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اعلیٰ ترین دعا بھی بندۂ مومن کے عمل سے مشروط ہے، جس کے بغیر کوئی سفارش آگے نہیں بڑھ سکتی ہے، جیسا کہ سورۃ نجم (۵۳) میں ارشاد ہوا ہے:-

(ترجمہ): اور بہت سے فرشتے آسمان میں موجود ہیں ان کی سفارش ذرا بھی کام نہیں آسکتی مگر بعد اس کے کہ اللہ جس کے لئے چاہے اجازت دے اور راضی ہو (۵۳)، اس ربّانی تعلیم کا واضح اشارہ یہ ہے کہ عظیم فرشتے تو اپنی خصوصیت و عادت کی بناء پر اہل زمین کے لئے



نیک دُعا کرتے رہتے ہیں، مگر وہ دُعا کسی بندے کے حق میں اس وقت قبول ہو جاتی ہے جبکہ وہ علم و عمل سے آراستہ ہو جاتا ہے۔

۲۔ امام موصوفؒ سے روایت کی گئی ہے کہ پیغمبر خداؐ نے ارشاد فرمایا: علم کا پہلا مرحلہ خاموشی ہے، دوسرا مرحلہ غور سے سُنانا ہے، تیسرا اس پر عمل کرنا، اور چوتھا اس کا پھیلانا ہے۔ اس حدیث کا ظاہری پہلو محتاج وضاحت نہیں، کیونکہ وہ خود واضح ہے، پھرنا پچھ یہاں جو سوال پیدا ہو جاتا ہے وہ اس حکم کی تاویلی حکمت سے متعلق ہے کہ اس سلسلے میں آنحضرتؐ کی سیرتِ طیبہ سے کیا اشارہ ملتا ہے؟ اس کا جواب یقیناً یہی ہے کہ خاموشی سے ذکر و عبادت کا نتیجہ مُراد ہے، جو محویت و فنا کی شکل میں سامنے آتا ہے، جس کا نمونہ اعلیٰ سرورِ انبیاء صلوات اللہ علیہ وآلہ کی ابتدائی زندگی ہی سے ملتا ہے کہ آپؐ علم کے مرحلہ اول میں کثرت سے عبادت کرتے ہوئے عالمِ دل پر ایسے سکوت کی کیفیت طاری کر لیتے تھے، کہ اس میں اللہ جلّ شانہ کے اسمِ ابر کے سوا ہر قلبی آواز مفقود ہو جاتی تھی، اس مثال کا منشا یہ ہے کہ اگر کسی انسان کے دل میں وسوسوں یا خیالاتِ و افکار کا طوفان برپا ہے تو اس صورت میں اگرچہ وہ بظاہر خاموش ہو لیکن اصل خاموشی نہ ہوگی لہذا دُنیا تے دل کی مکمل خاموشی کے لئے پیغمبرِ اسلامؐ کی پیروی کرتے ہوئے یادِ خدا کا سہارا لینا ہوگا۔

۳۔ ایک موقع پر حضورِ انورؐ نے فرمایا: اِنَّ عَلِيًّا صَيِّبٌ وَاَنَا مِنْهُ۔ بیشک علی مجھ سے ہے اور میں اُس سے ہوں۔ اس

ارشاد میں بہت سی حکمتیں ہیں، اُن میں سے چند اس طرح ہیں :-

الف : نُوْرِ نُبُوْت سے نُوْرِ وِلَايَت کا ظہور ہو جاتا ہے، اور پھر نبی کا نُوْرِ وِلَايَت (امامؑ) کے نُوْر میں مدغم ہو جاتا ہے۔

ب : پیغمبر نے بحکم خدا مولا علیؑ کو تمام مسلمانوں کا امام بنایا، اور علیؑ نے علم و حکمت کے باب (دروازہ) کی مرتبت میں آنحضرتؐ کی نُوْرِ اِنْبِيْت سے لوگوں کو آگاہ کر دیا۔

ج : مقام تنزیل پر ناطقؑ نے اساس کا ظاہری تعارف کرایا، اور مقام تاویل پر اساسؑ نے ناطقؑ کی باطنی معرفت کی تعلیم دی۔

۴ - رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ روایت منقول ہے آپ فرماتے ہیں کہ : جو لوگ خدا پر اور مجھ پر ایمان لے آتے ہیں اور میری نبوت کی تصدیق کر چکے ہیں، میں ان کو امیر المؤمنین مولا علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولایت کی وصیت کرتا ہوں، کیونکہ علیؑ سے محبت کرنا مجھ سے محبت کرنا ہے، یہ ایک امر ہے جس کے لئے میرے رب نے مجھ کو مامور فرمایا ہے، اور ایک ایسا عہد ہے جو مجھ سے لیا گیا ہے اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں یہ پیغام تم کو پہنچا دوں۔

حضرت رسالت مآبؐ کی اس نُوْرِ اِنْبِيْت میں سب سے عظیم حکمت یہ ہے کہ خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان لانا دین کا پہلا مرحلہ ہے، نبوت و رسالت کی تصدیق کرنا دوسرا مرحلہ ہے، اور مولا علیؑ صلوات اللہ علیہ کی ولایت کا اقرار کرنا تیسرا مرحلہ ہے، اس نکتہ میں بہت سے

اشارے ہیں، دوسری حکمت لفظ ”ولایت“ میں ہے کہ اس کے کئی معنی ہیں اور تیسری حکمت اس بات میں ہے کہ خداوند عالم نے حضرت خاتم الانبیاء سے ولایتِ علمی کے باب میں عہد لیا، اور یہ حکمت ایسی اہم ترین اور مفید ترین ہے کہ اس کے سمجھ لینے سے قرآنِ حکیم کے بہت سے اسرار کھل جاتے ہیں، جس کی ایک مثال اس طرح ہے :-

سورۃ احزاب (۳۳) میں ارشاد فرمایا گیا ہے: اور جبکہ ہم نے تمام پیغمبروں سے ان کا اقرار لیا اور آپ سے بھی اور نوحؑ اور ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ ابن مریمؑ سے بھی اور ہم نے ان سے خوب پختہ عہد لیا (۳۳) جو حدیث صحیح ہوتی ہے وہ آیاتِ قرآنی کی عقلی اور منطقی ترجمانی کرتی ہے چنانچہ ظاہر ہے کہ اس آیتِ کریمہ کی وضاحت مذکورہ بالا حدیث سے فرمائی گئی ہے، یعنی پروردگار عالم نے ہر پیغمبر سے اس بات کا عہد لیا تھا کہ وہ لوگوں کو امرِ امامت سے آگاہ کرے گا۔

۵۔ حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے، آپ نے فرمایا کہ: علم کے اٹھ جانے سے پہلے اسے حاصل کرو، آپ نے دستِ مبارک بلند کر کے فرمایا کہ علم اس طرح نہیں اٹھے گا، لیکن بات یہ ہے کہ قوم میں عالم ہوگا، پھر وہ اس دُنیا سے چلا جائے گا اور اسی کے ساتھ علم بھی اٹھ جائے گا، اور قوم میں دوسرا عالم ہوگا، وہ بھی وفات پائے گا اور اس کا علم بھی رفع ہو جائے گا.....

۶۔ رسول اکرم صلعم سے روایت کی گئی ہے، آپ نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ

لوگوں سے علم بطریقِ انتزاع (دیکھنے کر) قبض نہیں کرتا، لیکن علماء کی وقات سے علم کو اپنے قبضہ قدرت میں لیتا ہے.....

۵ اور ۶ سے ظاہر ہے کہ علم مٹی میں نہیں جاتا، بلکہ خدا سے اپنے ہاتھ میں اٹھا لیتا ہے، جبکہ یہ ایک تخت پر بلند ہو جاتا ہے، اور تخت نیک اعمال سے بنتا ہے، جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے: پاک قول یعنی علم، اسی کی طرف بلند ہو جاتا ہے اور عملِ صالح ہی اس کو اٹھا کر لے جاتا ہے (۱۰) <sup>۳۵</sup>

۷۔ حضرت امیر المؤمنین علی صلوات اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میرے اہل بیت کا مقام تمہارے درمیان کشتی نوحؑ کی طرح ہے کہ جو اس میں سوار ہو گیا اس نے نجات پائی اور جس نے اس کی مخالفت کی وہ غرق ہو گیا، آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ: میرے اہل بیت کے عالم سے علم حاصل کرو یا پھر اُس سے جس نے خود اہل بیت کے عالم سے علم حاصل کر لیا ہو، تاکہ تم دوزخ سے نجات پاؤ گے۔ کشتی نوحؑ اور عالمِ اہل بیت سے امام زمانؑ مراد ہے، جو خدا و رسولؐ کی طرف سے طوفانِ جہالت اور آتشِ نادانی سے لوگوں کو بچانے کے لئے مقرر ہے، یہی سبب ہے کہ قرآن حکیم کی تمام مثالوں میں حقیقی علم کی جتنی تعریف کی گئی ہے، جہالت و نادانی کی اتنی مذمت ہے۔

۸۔ یہ ایک مشہور و معروف تاریخی واقعہ ہے کہ غدیر خم میں حضورؐ

اکرمؑ نے اصحاب سے مخاطب ہو کر فرمایا: اے لوگو! انجوب جان لو کہ علیؑ کا مرتبہ میرے نزدیک وہی ہے جو ہارون کا مرتبہ موسیٰ کے نزدیک تھا مگر میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، علیؑ میرے بعد ولی ہے، اور جس کا میں مولود آقا ہوں اس کا علیؑ مولود آقا ہے، پھر آپ نے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر دعا کی کہ: اے اللہ! تو اس شخص سے محبت کر جو علیؑ سے محبت کرتا ہے اور اس سے عداوت کر جو علیؑ سے عداوت کرتا ہے اور اس کی مدد کر جو علیؑ کی مدد کرتا ہے اور اس کی مدد نہ کر جو علیؑ کی مدد نہیں کرتا، اور علیؑ جہاں کہیں بھی ہو وہیں تہی سہی اس کے ساتھ کر دے۔

رسول کریم کا یہ ارشاد کئی اعتبارات سے بہت بڑی اہمیت کا حامل

ہے، اور یہ نہ صرف دین کی اساسی حقیقتوں سے بھرپور ہے بلکہ اعلیٰ حکمتوں سے بھی مملو ہے، اس میں سب سے پہلے ضروری طور پر سنتِ خدائی اور قرآنی حوالے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ دینِ حق میں آسمانی کتاب کی وراثت اور پیغمبر کی جانشینی کوئی نیا واقعہ نہیں، جبکہ ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ کا یہی قانون رہا ہے، مگر اس میں یہ فرق ضرور ہے کہ آنحضرت کے بعد کوئی نبی نہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں لوگوں کے لئے ہادی برحق کا تقرر اپنی سنت قرار دیا ہے، جس کی روح میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔

اس ارشادِ نبوی سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ آنحضرت کے بعد کوئی

نبوت و رسالت نہیں، مگر ولایت و امامت ہے، کیونکہ مذکورہ حدیث

بزرگ زبان حکمت یہ کہہ رہی ہے کہ ہمیشہ مولا و آقا کا موجود ہونا ضروری ہے۔

یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ صاحبِ خلقِ عظیم (۶۸) کسی ایسے جذبے کے تحت مولا علیؑ کے حق میں دُعا کرے جو سنتِ الہی اور قانونِ دین کے خلاف ہو؟ اس سے ظاہر ہے کہ یہ دُعا دراصل دستورِ دین کی ترجمانی کی غرض سے ہے، اور یہ اسلام کی سب سے حسین ترین مثال ہے کہ خدا اُس شخص سے محبت کرے جو اس کے منظر سے محبت کرتا ہے، اور علم و رحمت کا سب سے عظیم خزانہ اسی تصور میں پوشیدہ ہے جو رسولِ اکرمؐ نے دیا۔

۹۔ ارشادِ نبوی ہے: العلم نور يجعله الله في

قلب من يشاء من عباده = علم ایک نور ہے خدا اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے یہ (نور) اس کے دل میں رکھتا ہے۔ یہ صفت سب سے پہلے اور سب سے کامل طور پر حضراتِ انبیاء و ائمتہ علیہم السلام کے لئے شایانِ شان ہے، اور پھر اسی وسیلے سے بقدر اطاعت ہر مومن کو علم کی روشنی مل سکتی ہے، بہر کیف علم نور ہے اور نورِ علمی صورت میں ہے، چنانچہ قرآنِ مقدس میں یہاں نور کا ذکر ہے وہ علم کی بات ہے، اور جہاں علم کا تذکرہ ہے، وہ نور کا بیان ہے۔

نور کی ظاہری تعریف یہ کی گئی ہے کہ نور وہ شے ہے جو پوشیدہ چیزوں کو ظاہر کرتی ہے اور خود بھی ظاہر ہوتی ہے، جیسے سورج، مگر نور کی یہ تعریف کافی نہیں، کیونکہ اس کا دوسرا پہلو بھی ہے، جو اس سے مختلف ہے، مثال کے طور پر جب صبح صادق کا وقت ہوتا ہے تو تب سے روشنی پھیلنے لگتی ہے بغیر

اس کے کہ سُورج طلوع ہو چکا ہو، نیز روشنی اس وقت بھی ختم نہیں ہوتی، جب سُورج بادلوں کے ادھ میں ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ نُور ظاہر بھی ہے اور باطن بھی، وہ دکھائی دیتا ہے اور دکھائی نہیں دیتا، چنانچہ نُورِ علم کی دو صورتیں ہوا کرتی ہیں، ایک وہ جو نظر آتی ہے، اور دوسری وہ جو نظر نہیں آتی، مگر ان دونوں صورتوں میں علم کا وجود ہوتا ہے۔

۱۰۔ نُورِ اگریہ سہ ستمہ اعلیٰ میں ایک ہی ہے، لیکن مذکورہ دو صورتوں (مرتی اور غیر مرتی) کے تحت اس کی بہت قسمیں ہیں، جیسے حضرت امام جعفر الصادقؑ کا یہ دُعائیہ ارشاد ہے، جس میں یہ مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ ظاہر و باطن کے حواس میں سے ہر حس، ہر قوت اور ہر جہت کے لئے ایک نُور مقرر ہے، وہ دُعایہ ہے:-

اللَّهُمَّ اجْعَلْ لِي نُورًا فِي قَلْبِي، وَنُورًا فِي سَمْعِي، وَنُورًا فِي بَصَرِي، وَنُورًا فِي لِسَانِي، وَنُورًا فِي شَعْرِي، وَنُورًا فِي بَشْرِي، وَنُورًا فِي لَحْمِي، وَنُورًا فِي عِظَامِي، وَنُورًا فِي عَصَبِي، وَنُورًا مِنْ بَيْنِ يَدَايَ وَنُورًا مِنْ خَلْفِي، وَنُورًا عَنْ يَمِينِي، وَنُورًا عَنْ يَسَارِي، وَنُورًا مِنْ فَوْقِي، وَنُورًا مِنْ تَحْتِي۔

(ترجمہ) یا اللہ میرے لئے میرے دل میں ایک نُور بنا دے، میرے کان میں ایک نُور، میری آنکھ میں ایک نُور، میری زبان میں ایک نُور، میرے

بالوں میں ایک نُور، میری کھال میں ایک نُور، میرے گوشت میں ایک نُور، میرے نوں میں ایک نُور، میری مڈیوں میں ایک نُور، میری رگوں میں ایک نُور، میرے سامنے سے ایک نُور، میرے پیچھے سے ایک نُور، میرے دائیں سے ایک نُور، میرے بائیں سے ایک نُور، میرے اُدپر سے ایک نُور، اور میرے نیچے سے ایک نُور نائے۔

اس سے یقینی طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ انسانِ کامل کا مبارک وجود سراپا نور اور اللہ کی قدرتِ کاملہ کا ایک مکمل نمونہ ہوا کرتا ہے، جس میں اگرچہ نورِ اصلاً ایک ہی ہوتا ہے تاہم مختلف حواس و مدركات کی تقویت و رہنمائی کی خاطر اس کی الگ الگ قسمیں ہوتی ہیں، جیسے مذکورہ بالا دُعا سے ظاہر ہے۔

۱۱۔ ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے روایت کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

لَا عَمَلَ إِلَّا بِنِيَّةٍ ، وَلَا عِبَادَةَ إِلَّا لِيَقِينٍ ،  
وَلَا كَرَمًا إِلَّا بِالتَّقْوَى

کوئی عمل نیت کے بغیر مقبول نہیں، نہ یقین (معرفت) کے بغیر کوئی عبادت قبول ہوتی ہے، اور نہ تقویٰ کے بغیر کوئی کرامت و بزرگی ہے۔ نیت کے بارے میں جیسا حکم ہے اس کو سب جانتے ہیں، مگر بے یقین عبادت اور بایقین عبادت کے درمیان جو فرق و تفاوت ہے، اس کا جاننا ہر شخص کے بس کی بات نہیں، چنانچہ جاننا چاہیے کہ لفظ یقین دراصل معرفت کے مترادفات میں سے ہے، جبکہ یقین کے معنی قرآنی



اعتبار سے بہت اعلیٰ ہیں، جیسے علم الیقین، عین الیقین، اور سچ الیقین، اس کا مطلب یہ ہوا کہ مقبول عبادت کا پہلا مقام علم الیقین ہے، دوسرا عین الیقین اور تیسرا سچ الیقین ہے، اور یہ معرفت کے درجات ہیں۔ الحمد للہ رب العالمین۔

نوٹ: اس مقالہ کی تمام حدیثیں کتاب ”دعائم الاسلام“  
جزء اول سے لی گئی ہیں۔

امام اقدس و اطہرؒ کا ایک ادنیٰ غلام  
نصیر الدین نصیر ہونزائی

۱۲۔ نومبر ۱۹۸۳ء

## رُوح اور حضرت آدمؑ

رُوح اور حضرت آدم علیہ السلام کے موضوع کے سلسلے میں سب سے پہلے یہ جاننا از بس ضروری ہے کہ آیا قبل از آدمؑ لوگ کسی بھی سیارے پر موجود تھے یا نہیں؟ اگر وجود انسانی کا سلسلہ پہلے ہی سے چلا آیا ہے، تو اُس کا کیا ثبوت ہے؟ اگرچہ اس کا مدلل بیان کتابِ رُوح کیا ہے؟ "میں ہُوچکا ہے تاہم اس موضوع کی بہت بڑی اہمیت ہونے کی وجہ سے یہاں بھی چند روشن دلائل پیش کتے جاتے ہیں کہ انسان بالکل ایسا قدیم ہے جیسی خُدا تعالیٰ کی بادشاہی قدیم ہے، وہ دلیلیں مندرجہ ذیل ہیں:-

۱۔ سورۃ روم کے ایک ارشاد (نہ ۳۰) میں جس طرح فرمایا گیا ہے اس کا واضح مفہوم یہ ہے: "دینِ حنیف (اسلام) دینِ فطرت ہے، اور اللہ تعالیٰ کی فطرت (تخلیق و پیدائش) وہی ہے جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا، خُدا کی پیدائش کا جو طریقہ مقرر ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں، اور یہی دینِ قائم ہے"۔ اس قرآنی دلیل سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی جسمانی پیدائش قانونِ فطرت کے عین مطابق تھی، یعنی آپ کو اللہ تعالیٰ نے

بالکل اسی طرح پیدا کیا تھا جس طرح وہ دوسرے سب لوگوں کو پیدا کرتا ہے۔  
 ۲۔ لفظ انسان، انس اور انسیا کو بھی بلا کر قرآن حکیم میں کل ۸۴ بار استعمال کیا گیا ہے، یہ افراد بشر کا ایک ایسا مشترکہ نام ہے، کہ اس کا اطلاق نہ صرف بنی آدم پر ہوتا ہے، بلکہ اس کا اشارہ سب سے پہلے آدم کی طرف ہوتا ہے، چنانچہ سورہ دہر کے آغاز (۲) میں جس طرح انسان کی پیدائش کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے، اس کی وضاحت کے بعد یہ کلمہ (عام قاعدہ) بن جاتا ہے کہ ہر انسان ماں یا باپ سے پیدا ہو جاتا ہے، خواہ وہ حضرت آدمؑ ہو یا حضرت عیسیٰؑ، کیونکہ وہ دونوں عظیم پیغمبر ہی جسم سے انسان تھے۔

۳۔ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۱۳ میں یہ تذکرہ موجود ہے کہ سلسلہ انبیاء کے شروع ہونے سے قبل لوگ ایک ہی اُمت تھے، یا ایک ہی طریق پر تھے، پھر اللہ نے پیغمبروں کو بھیجا (۲۱۳) اس سے صاف ظاہر ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام مذکورہ لوگوں کے بعد اور انبیاء علیہم السلام کے سلسلے میں نبی اول کی حیثیت سے تھے۔

۴۔ قرآن حکیم میں آدم و اولادِ آدم کی پیدائش سے متعلق ایک ہی قانون کا ذکر بار بار ملتا ہے، جو لفظ انسان کے تحت آتا ہے جیسے سورہ مومنون (۱۲-۱۴) میں تخلیق انسانی کے سات مراحل کا ذکر فرمایا گیا ہے، وہ مندرجہ ذیل ہیں:  
 الف: خلاصۃ خاک۔

ب: نطفہ۔

ج: بَلَقَ۔

د: بِمُضْغٍ۔

ه: عِظَامٍ۔

و: لَحْمٍ۔

ز: خَلْقٍ آخِرٍ۔

پیدائش کے ان درجات سے گزرنے بغیر کوئی فرد بشر خلق

آخر نہیں بن سکتا، اور نہ ہی وہ احسن الخالقین کی مخلوق کہلا سکتا ہے (۲۳/۱۴)

۵۔ آل عمران کے ایک ارشاد (۵۹/۳) میں غور کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا

ہے کہ حضرت آدمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش ایک جیسی (یعنی قانونِ فطرت کے مطابق) تھی، اور ان دونوں کی روحانی تکمیل کے موقع پر خداوند تعالیٰ نے کسُنْ دہو جا، فرمایا تھا، اس حکم سے یقیناً یہ معلوم ہو گیا کہ حضرت آدمؑ کے جسمانی والدین تھے، جس طرح حضرت عیسیٰ کے ماں باپ تھے، وہ حضرت مریم اور یوسف نجار تھے۔

۶۔ آپ حکیم ناصر خسروؒ کے ”رسالہ حکمتی“ جو فارسی میں ہے کو دیکھ

سکتے ہیں کہ پین کا اصل فارسی ترجمہ ”پیری“ ہے، یعنی ایسی پوشیدہ اور

لطیف مخلوق جو پرواز کر سکتی ہے، چنانچہ قرآن پاک (جو اللہ تعالیٰ کے

عظیم بھیدوں کا خزانہ ہے) میں باعتبار پیدائش کبھی انسان پہلے میں

(۱۴-۱۵) اور کبھی جنات (۲۷/۱۵) جس کی وجہ دائرہ آفرینش ہے جس پر

یہ دونوں مخلوق شب و روز کی طرح ہیں، یا یوں کہنا چاہیے کہ ریشم کے

کیڑوں اور ان سے بنے ہوئے پروانوں کی طرح ہیں، اگر آپ کیڑوں کے موسم میں ان کے ماضی کا تذکرہ چھیڑنا چاہتے ہیں تو یہ کہنا درست ہوگا، کہ پہلے پروانے تھے، اگر اس کے برعکس پروانوں کا وقت ہے تو آپ یہ کہیں گے کہ پہلے کیڑے تھے، یہ تو جڑوی بات ہوگئی، اور اگر آپ کو اس سلسلے کی کھلی بات کرنی ہے تو پھر کہنے لگیں گے کہ دونوں قسم کی مخلوق میں کوئی زمانی تقدیم و تاخیر نہیں، یعنی باعتبار وقت ایک آگے اور ایک پیچھے نہیں۔

۷۔ اب یہاں مذکورہ حقیقتوں کی روشنی میں یہ عرض کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بادشاہی کی نہ تو کوئی ابتداء ہے اور نہ کوئی انتہا، بلکہ یہ ہمیشہ قائم ہے، اور اس بادشاہی کے تحت انسان کا بھی ہمیشہ ہونا لازمی ہے، چنانچہ ہر دور کے لئے ایک آدم ہوا کرتا ہے، اور ہر دور کے آخر میں انسان کثیف سے لطیف ہو جاتے ہیں، یہ صرف جسم کی بات ہے، اعمال کی بات نہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس دور کے آدم سے قبل سیارہ زمین پر نبات کے کثرت سے ہونے کی جو روایت ملتی ہے، وہ بالکل صحیح ہے، اور اس دور کے آخر میں بھی انسان کو جسم لطیف عطا ہوگا، جس کی مثال اُٹرن ٹشتری ہے، جس کے بہت سے قرآنی نام ہیں۔

۸۔ اگر ہم نظام ادوار کو مانتے ہیں، اور اس کے ساتھ ساتھ حکمت قرآن کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو پھر اس قانونِ رُوح کو قبول کرنا ہوگا کہ جب آدم سابق کا دور مکمل ہو کر ہمارے بابا آدم کا دور شروع ہوا، تو اُس وقت پروردگارِ عالمین نے تمام اگلے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی ذریعات

کولے کر خلیفہ دور (یعنی آدم) کی روحانیت میں حاضر کر دیا، اور عہد پیمان لینے کے بعد ان کو موجودہ آدم کی اولاد قرار دیا (۱۲۲) اور یہی معجزہ سلسلہ خلافت (یعنی نبوت و امامت) کی ہر شخصیت میں سب سے پہلے واقع ہوتا ہے۔

۹۔ قصہ آدم میں جس طرح رُوح کا ذکر فرمایا گیا ہے، اس میں انتہائی عظیم حکمتیں پوشیدہ ہیں، جیسے خدائے بزرگ و برتر نے رُوحِ کامل کو حضرت آدم میں پھونک دینے سے پہلے اپنی ذاتِ پاک سے منسوب کرتے ہوئے فرمایا: رُوحی (۱۵/۲۴، ۲۸)، یعنی میری رُوح، مگر یہاں جو عظیم پنہاں ہے، اس کی معرفت بڑی ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ مذکورہ خدائی رُوح، جو جناب آدم میں پھونک دی گئی، یا جو نورِ صمد منتقل کیا گیا، وہ قبلاً دوسرے انسانِ کامل میں تھا، اور جہاں رُوحِ خدا۔ نورِ خدا میں اللہ تعالیٰ کی خصوصی نسبت کا سوال پیدا ہوتا ہے، وہاں اس حقیقت کی کئی قرآنی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، کہ اس میں ذاتِ سبحان سے رُوحِ اعظم کی وابستگی جیسی کوئی بات نہیں، بلکہ یہ نسبت، اس رُوح کی عظمت، علو مرتبتِ پاکیزگی شرافت، اور قربِ الہی کا نام ہے، اس کی کچھ مثالیں درج ذیل ہیں:-

۱۰۔ اللہ کی رسی (۱۰۳)، خدا کا گھر (۱۲۵)، خدا کا ہاتھ (۱۰)، پہلوئے خدا (۳۹)، چہرہ خدا (۲۷)، اللہ تعالیٰ کے آیام (۱۴)، کتاب اللہ (۵۶)، راہِ خدا (۱۰۸)، اُس کی کرسی (۲۵۵)، اس کا تخت (۱۷)، قلمِ الہی (۴)، وغیرہ، یہ تمام عالی مرتبت اور مقدس چیزیں جس طرح خداوندِ تعالیٰ سے منسوب

کی گئی ہیں، اس کی وجہ اللہ پاک کی قربتِ خاص ہے، اور خدا کی رُوح ان مثالوں سے ہرگز مختلف نہیں، یعنی خُدا تے پاک اس بات سے بے نیاز و برتر ہے کہ رُوح اس کا جزو ہو۔

۱۱۔ آپ نے قرآن حکیم کے عظیم موضوعات کے سلسلے میں سُنّت اللہ“ کے موضوع کا خوب غور سے مطالعہ کیا ہوگا، کیونکہ یہ امر انتہائی ضروری ہے، خُدا کی سُنّت یا عادت، (جسے آپ قانونِ الہی بھی کہہ سکتے ہیں) یہ ہے کہ وہ تبارک و تعالیٰ ہمیشہ سلسلہء ہدایت کو جاری و باقی رکھتا ہے، اللہ کی عادت کی سب سے روشن حقیقت نورِ عالی نور (۳۵) ہے، یعنی نُور کی ایک شخصیت کے بعد دوسری شخصیت کا ہونا، اس سے ظاہر ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام وہ چراغِ علم و حکمت تھے، جس کو سابق چراغ کے شعلے سے فروزان کیا گیا تھا، اور اگر آپ ”ایک نُور کے بعد دوسرا نُور“ اس کلمہ میں غور کریں، تو آپ کو بڑا تعجب ہوگا کہ سلسلہء نُور کا کوئی آغاز نہیں، یعنی اس کا کوئی ابتدائی سرِ نظر نہیں آتا ہے، بلکہ یہ ازل سے ابد تک چلتا رہتا ہے۔

۱۲۔ اللہ تعالیٰ کے پروگرام یا اعلان کے مطابق خلافتِ آدم کا تعلق اہل زمین سے تھا (۳۱) لیکن ایسا کیوں ہوا کہ حضرت آدم کے ”علمِ اسماء“ یعنی علمِ حقائق کا سارا فائدہ ہر بہانے سے فرشتوں کو حاصل ہوا؟ آیا اس میں کوئی راز ہے؟ جی ہاں، اس میں بہت بڑا راز اور بہت بڑی حکمت ہے، وہ اس طرح کہ قصہء آدم کے فرشتے

اہل زمین ہی میں سے تھے، وہ اہل ایمان تھے، جن کو اپنی رُوح کے پر لے کر سے نذرِ آدم تک رسائی ہوئی تھی، بالفاظِ دیگر وہ سب کے سب بصورتِ ذرات اپنے وقت کے "عالمِ شخصی" میں داخل ہو گئے تھے، اس کے یہ معنی ہوتے کہ رُوح کے ڈوبنے ہو کر رہتے ہیں، یہ سب اشر ہے اور وہ برافرشہ رُوح ایک رستے کی طرح یا پل کی طرح اس لئے ہے کہ وہاں سے کوئی چیز آئے، اور یہاں سے کوئی چیز جاتے، ہم اس مثال کی روشنی میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ پیاری رُوح کے اس پل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ دنیا و آخرت کو باہم ملا دیتا ہے۔

۱۳۱۔ حضرت آدمؑ سے متعلق قصہ قرآن کے ہر ہر لفظ میں معرفت کے بھیدوں کا ایک خزانہ پوشیدہ ہے، مثال کے طور پر لفظ نَفِخ (پھونکنا) کو لیجئے، کہ یہ لفظ مختلف صیغوں میں قرآن حکیم کے میں مقامات پر مذکور ہے، اور ظاہراً ایسے تین الگ الگ معنوں کے لئے استعمال ہوا ہے کہ وہ باطناً یکجا ہیں، وہ تین معنی یہ ہیں:-

الف: پھونکنی (دھونکنی) سے پھونکنا، تاکہ لوہے کے ٹکڑے آگ کی طرح سُرخ ہو جائیں (۱۸/۹)، اس کی تاویل "قیامت خیز عبادت" ہے، جو ہر پیغمبر اور ہر امام بجا لاتا ہے۔

ب: صور پھونکنا، کیونکہ انفرادی قیامت کے جملہ مراحل سے آگے گزرنے بغیر آدم علیہ السلام حاملِ نور، خلیفہ خدا، سرِ چشمہ علم و حکمت اور فرشتوں کا مسجود و مُعَلَّم نہیں ہو سکتے تھے۔



ج: رُوح پھونکتا، یہ نُور اُعلیٰ نُور کے دائمی قانون کے تحت ایک کامل شخص سے دوسرے کامل شخص میں نُور کی منتقلی کا نام ہے، پس جس طرح حضرت آدمؑ نے ”انقلابی عبادت“ کی، جیسی آپؐ کی ذاتی قیامت بڑا ہوئی، اور جس معنی میں اُن میں نُور منتقل ہو گیا، اس کے حقائق و معارف اندرونی طور پر سراسر قرآن حکیم میں پھیل جاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی بے بدل (ڈال)، سنت کے مطابق جو حاملانِ نُور میں سے گزرتی چلی آتی ہے تمام انبیاء علیہم السلام کا ایک ہی قصہ بن جاتا ہے۔

۱۴۔ اگرچہ ظاہری تاریخ آپ کو واقعاتِ آدمؑ سے ہزاروں سال دُور لے آتی ہے، لیکن قرآن اور نُورِ ہدایت کا یہ معجزہ ہے کہ اس کی بدولت آپ یقیناً حضرت آدم علیہ السلام کو انتہائی قریب سے دیکھ سکتے ہیں، کیونکہ عالم و آدم کی تخلیق سے خلافتِ الہیہ مقصود تھی، جو حسبِ منشا تے خداوندی سلسلہٴ انبیاء و ائمہ علیہم السلام میں جاری و باقی ہے، جیسا کہ سورۃ نُور (۲۴/۵۵) میں ارشاد ہوا ہے :-

اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے اُن لوگوں کے ساتھ جو بحقیقت، ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اُسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے۔ اس پورچھتِ تعلیمِ سماوی میں پیغمبروں اور اماموں کی خلافت کا ذکر ہے، جو حضرت آدمؑ کی خلافتِ عالیہ کا سلسلہ ہے جو رہتی دُنیا تک قائم رہے گی، مُسلمین و منہن کو اس سے بیش از بیش فائدہ حاصل ہونے کے لئے زیادہ سے زیادہ فرما جائے

شرط ہے، تاکہ خلیفہ خدا جو ہر زمانے میں موجود ہے کی معرفت حاصل ہو، پس  
اسی پہچان میں تمام معرفتیں مرکوز ہو جاتی ہیں، اور یہی رُوح  
کی تفصیلی ملاقات کا نتیجہ ہے۔

## نصیر الدین نصیر ہونزائی

۲- مارچ ۱۹۸۵

---

لہ ہر پیغمبر اور ہر امام خدا کے حکم سے رُوح پھونک دیتا ہے، سہمت عیسیٰ  
کی مثال دیکھتے:  $\frac{۲}{۱۱۰}$ ،  $\frac{۲}{۱۱۰}$

# رُوحِ اِسْلَام

رُوح کے معنی جان، بیوہ، آتما، نُور، ست، جوہر، اور دل ہیں، اسلام سے دینِ حق مراد ہے، جسے حکمِ خدا حضورِ انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کے سامنے پیش کیا، چونکہ اسلام اللہ تبارک و تعالیٰ کا دین ہے، اس لئے یہ تمام انبیاء علیہم السلام کا واحد دین ہے، اور اسی کا نام دینِ فطرت ہے۔ اس اہم موضوع کے سلسلے میں سب سے پہلے اس حقیقت پر قرآنی روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے کہ مجملہ انبیاء و رسل علیہم السلام اپنے اپنے زمانے میں ایک ہی دینِ حق کی دعوت و تبلیغ کیا کرتے تھے، اور وہ خدائے واحد کا لکھا و یگانہ دین تھا، جس کی تعبیر بعد کے زمانے میں لفظ ”اسلام“ سے کی گئی، جیسا کہ پروردگارِ عالم کا مقدس ارشاد ہے :-

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا  
 وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ  
 وَمُوسَى وَعِيسَى أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ  
 (۲۲/۱۳) اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے واسطے وہی دین مقرر کیا جس کا اُس نے

نوحؑ کو حکم دیا تھا اور جس کو ہم نے آپ کے پاس وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کا ہم نے ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو حکم دیا تھا کہ اسی دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔

اس آیہ حکمت آگین سے یہ حقیقت بدرجہ یقین روشن ہو کر سامنے آتی ہے کہ دین اسلام اور اس کی شریعتِ عالیہ کا آغاز دراصل زمانہ نوحؑ سے ہوا، اس کے واضح معنی یہ ہوتے ہیں کہ اسلام دینِ فطرت ہے، اور فطرت کا بہترین نمونہ اس کائنات میں انسان ہیں (۳۱) قرآن حکیم کے اس حوالہ میں کہ: "خدا کی فطرت وہ ہے جس کے مطابق اُس نے لوگوں کو پیدا کیا (۳۲)" بہت سے اشارات موجود ہیں، مختصر یہ کہ اسلام دینِ فطرت ہونے کی بنا پر اپنے اندر زمان و مکان کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگی کی صلاحیت رکھتا ہے، کیونکہ یہ آفاقی دین ہے، لہذا یہ ہمیشہ زندہ غیر منجمد اور ضروریاتِ (DYNAMIC) ہے، جیسا کہ شریعتِ حکم ..... (۳۳) کی آیتِ پاک میں بزبانِ حکمت فرمایا گیا ہے کہ حضراتِ انبیاء نے اسلام کو وقت اور جگہ کے مطابق لوگوں کے سامنے پیش کیا تھا، مگر دین کی رُوح اور حقیقت ہمیشہ سے کسی تبدیلی کے بغیر ایک ہی شان سے چلی آئی ہے۔

اس وضاحت کے باوجود کوئی شخص قرآنِ مقدس ہی کے حوالے سے یہ سوال کر سکتا ہے کہ: جب خدا تعالیٰ نے ہر اُمت کے لئے ایک شریعت اور ایک منہاج یعنی طریقت (۳۴) مقرر کر دی ہے، تو پھر ہم کس طرح اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ آج جو شریعتِ محمدیؐ ہے،

وہ زمانہ نوح میں بھی تھی؟

اس کے جواب کے لئے میں یہ عرض کروں گا کہ دین اُس مُقدس مجموعہ تعلیمات کا نام ہے جس میں شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت سے متعلق باتیں جمع ہوا کرتی ہیں، چنانچہ دین ہمیشہ بحیثیت مجموعی اپنی جگہ قائم رہتا ہے، مگر شریعت اور طریقت کے بعض امور میں بمقتضائے زمان و مکان ترمیم ہو سکتی ہے، پس شریعت کے دو پہلو ہو گئے، ایک وہ جو شروع میں جیسا تھا، اب بھی ویسا ہے، دوسرا پہلو وہ ہے جس میں حکم خدا ترمیمات ہوتی رہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا مبارک ارشاد ہے: وَإِنَّ مِنْ شَيْعِيَّةٍ لِأَبْرَاهِيمَ (۳۴/۸۳) اور تحقیق نوحؑ کے طریقہ والوں سے ابراہیمؑ بھی تھے۔ یعنی حضرت ابراہیمؑ مذکورہ قانون کے مطابق حضرت نوحؑ کے پیرو بھی تھے، او آپؑ کی اپنی ایک شریعت و طریقت بھی تھی، جس طرح آنحضرتؐ ایک طرف سے ملت ابراہیمی کی پیروی کرتے تھے، اور دوسری طرف سے اپنی شریعت و طریقت رکھتے تھے، جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے:-

قُلْ إِنِّي هَدَانِي رَبِّي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ  
دِينًا قِيَمًا مِلَّةَ آدِيمٍ حَنِيفًا (۱۶۱)

آپ کہہ دیجئے کہ مجھ کو میرے رب نے ایک سیدھا راستہ بتلا دیا ہے کہ وہ دین قائم ہے جو طریقہ ہے ابراہیمؑ کا جس میں ذرا کجی نہیں۔ اس قرآنی محکم سے ظاہر ہے کہ اگرچہ خدا تعالیٰ نے ہر بڑے پیغمبر کو ایک

مخصوص ذیلی شریعت و طریقت عنایت کہ دی تھی، تاہم یہ بھی ایک روشن حقیقت ہے کہ جملہ انبیاء و رسل علیہم السلام کا مشترکہ دین اسلام ہی تھا، جس کا آغاز ظاہراً زمانہ نوحؑ سے ہو گیا تھا، کیونکہ یہ صراطِ مستقیم اور دینِ قائم ہے جس کو ہر زمانے میں موجود رہنا ہے، اور اس کی عدم موجودگی کے لئے کوئی وقت نہیں۔

یہاں یہ سوال بھی ممکن ہے کہ کوئی پوچھے کہ حضرت آدمؑ کا کیا دین تھا؟ اس میں کیا راز ہے کہ دورِ آدمؑ کے لوگوں کے مذہب اور شریعت کے بارے میں قرآن حکیم کچھ نہیں بتاتا؟

اس سلسلے میں یہ عرض ہے کہ نہ صرف حضرت آدمؑ کے زمانے میں بلکہ اس سے بہت بہت پہلے بھی ”دینِ قائم“ یعنی اسلام ہی تھا، مگر قانونِ حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ دین کے اول و آخر کے مفصل حالات کو پردہٴ انفا میں رکھا جائے، تاکہ نظامِ امتحان میں خلل نہ پڑے، اور جو لوگ غافل و کاہل ہیں، ان کو قبل از وقت عظیم بھیدوں کا پتہ نہ چلے، بس یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک میں قصہٴ آدمؑ بہت ہی مختصر اور انتہائی جامعیت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

ایک اور سوال: جب سب پیغمبر ایک ہی دین پر تھے، جس کا نام صراطِ مستقیم ہے (۱/۶، ۲/۶۹)، تو پھر اس کی کیا وجہ تھی کہ حضورِ اکرمؐ نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کو چھوڑ کر حضرت ابراہیمؑ کی پیروی کی؟ کیا اس کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ خاتم الانبیاء ان دونوں بزرگ پیغمبروں سے عظیم تر تھے؟ اگر بات

یوں ہوتی تو یہ تعمیر آخر زمان حضرت ابراہیمؑ کی بھی پیروی نہ کرتے، کیوں کہ حبیبِ خداؑ اعظم انبیاء اور سردارِ رُسل ہیں، تو پھر اس کا کیا سبب ہے؟  
 جواب: آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مذکورہ پیروی کسی اور سبب سے نہیں بلکہ آسمانی پروگرام کے مطابق تھی، وہ مطالعہ تاریخ اور پھر کسی طرزِ تہذیب و مسلک کا انتخاب جیسی بات نہ تھی، یہ پیروی اللہ کی مرضی سے ایک پیش آمد واقعیت و حقیقت کی صورت میں تھی، واقعہ یوں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے بڑے فرزند حضرت اسماعیلؑ امامِ مستقر تھے، اور چھوٹے فرزند حضرت اسحاقؑ امامِ مستودع، چنانچہ بنو اسماعیل میں امامتِ استقراری ہمیشہ کے لئے جاری و ساری رہی، مگر حضرت اسحاق کی نسل میں استبدادی امامت صرف آنحضرتؐ کے ظہور تک چل کر امامِ مستقر میں مدغم ہو گئی، اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ حضورِ اکرمؐ کے اپنے خاندان میں ائمہٗ مستقر کا پاک سلسلہ جاری تھا، جس کے توسط سے رسول اللہؐ نے بطورِ خاص قبل از نبوت بکلتِ ابراہیمی کی پیروی کی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ خواہش تھی کہ نہ صرف اپنی زندگی ہی میں بلکہ آئندہ زمانے میں بھی آپ کے لئے دین کے حقائق و معارف بیان کرنے والی زبان مقرر ہو، جیسا کہ قرآن حکیم میں اس حقیقت کا ذکر موجود ہے:

اے میرے پروردگار مجھے ایک حکم (یعنی کلمہ باری کی معرفت) عنایت کر اور مجھ کو صالحین سے ملا دے، اور میرے واسطے آئندہ آنے والوں میں سچی و صدق کی زبان مقرر کر دے (۸۳-۸۴) حضرت ابراہیمؑ

کی یہ دُعا لفظی فرق کے باوجود معنویت کی رُوح میں وہی ہے، جس میں آپ نے خدا تعالیٰ سے طلب کی تھی کہ آپ کی ذریت میں امامت قائم و برقرار ہے (۱۳۴ھ) اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی ہر دُعا کو قبول فرمایا تھا (۱۳۵ھ) سو اس کے معنی یہ ہوتے کہ امام ہر زمانے میں موجود اور حاضر ہوتا ہے، جو سچی باتیں بتانے کیلئے حضرت ابراہیم کی زبان ہے، جس کی تعلیمات کی آنحضرتؐ نے پیروی کی تھی۔

یہ بات ہمیشہ کے لئے یاد رہے کہ قوانینِ اسلام اللہ تعالیٰ کی صفات و سنت ہی کے مطابق ہیں، اور دین کا کوئی قانون دائرہٴ اسماء سے باہر نہیں، چنانچہ جب ارشاد ہوتا ہے کہ: **هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ** (۳۴) تو ان بابرکت ناموں کی اس نورانی تعلیم سے اہل دانش کو دینی حقیقتوں اور معرفتوں کے مقامات کا پتہ چلتا ہے، کیونکہ نہ صرف ضیا یا شئی اور روشنی ہی بلکہ دینی دولت کی فراوانی بھی وہاں ہوتی ہے، جہاں اللہ پاک کی کوئی صفت جلوہ گر ہو، جیسے ہم کائناتِ ظاہر کو روشن و تابان اور عجائب و غرائب سے آراستہ اس لئے دیکھتے ہیں کہ یہ خدائے بزرگ و برتر کے اسم **الظَّاهِر** کے تحت موجود اور قائم ہے، اور اس میں اشیائے ظاہر کی کوئی کمی نہیں، اس مثال سے یہ حقیقت نکھر نکھر کر روشن ہو جاتی ہے کہ اللہ جل جلالہ کے ان چار صفاتی اسماء سے چار عالموں کا وجود قائم و باقی ہے، یعنی **الاول** سے عالمِ ازل، **الآخر** سے عالمِ ابد **الظَّاهِر** سے عالمِ حیسانی، اور **الباطن** سے عالمِ روحانی کا قیام ہے۔

مذکورہ حقائق و معارف کی روشنی میں معلوم ہو جاتا ہے کہ دین کے بنیادی قوانین چار ہیں، یعنی قانونِ ازل، قانونِ ابد، قانونِ جسم (مادہ)



اور قانونِ رُوح، جیسے قلم، لوح، ناطق اور اساسیں ہیں۔ اب ہم انشاء اللہ اس موضوع سے متعلق سوال و جواب سے کام لیتے ہیں۔

سوال ۷: امامِ مستقر اور امامِ مستودع میں کیا فرق ہے؟ امامِ مستودع کا عمل کب سے شروع ہوا؟ کیا ہر زمانے میں امامِ مستودع کا ہونا ضروری ہے؟ امامت کے ان دو درجوں میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟

جواب: مذکورہ دونوں اماموں کے درمیان فرق یہ ہے کہ امامِ مستقر دینی بادشاہ کی حیثیت سے ہر زمانے میں موجود و حاضر ہوتا ہے، اور اس کا سلسلہ ہمیشہ جاری ہے، اس کے برعکس امامِ مستودع صرف اُس زمانے میں ہوتا ہے جبکہ حکمِ خدا امامِ مستقر حجاب سے کام لینا چاہتا ہے، امامِ مستودع کا عمل حضرت اسحاقؑ ابن حضرت ابراہیمؑ سے شروع ہوا، امامِ مستودع کا ہر زمانے میں ہونا ضروری نہیں، امامت کے ان دو درجوں میں کئی عظیم حکمتیں ہیں، اور ان میں سے ایک حکمت یہ ہے کہ جس طرح انسانی رُوح کے دوسرے ہیں، دو انائیں ہیں، اور وہ بیک وقت عالمِ علوی میں بھی ہے اور عالمِ سفلی میں بھی، پس اسی حقیقت کی طرف علمی اور عملی رہنمائی اور اشارہ کی غرض سے تو امامت کے یہ دو شخصی ظہور ہیں۔

سوال ۸: بنو ہاجرہ جو آنحضرتؐ کے ابا و اجداد تھے، ان میں آئمہِ مستقرین کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے چلتا رہا، اور حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اسی پاک خاندان سے پیدا ہوئے، حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذریت میں سلسلہ امامت کے جاری و باقی رہنے کے لئے جو دُعا کی تھی (۱۲۴) وہ بنو ہاجرہ اور بنو سارہ دونوں کے حق میں کی گئی تھی، پھر حضرت اسماعیلؑ کی اس فضیلت و توقیت کا کیا سبب ہے کہ آپ کی نسل میں ہمیشہ

روحانی سلطنت کا سلسلہ چلتا رہا، جس کا ذکر قرآن پاک (۵۴) میں موجود ہے؟  
 جواب: حضرت اسماعیلؑ ابن حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے فضائل میں سے  
 یہ چند اس طرح ہیں :

۱۔ حضرت اسماعیلؑ ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے کہ خداوند تعالیٰ نے ان  
 کو غلامِ عظیم ۱۰۱ جیسے پیارے نام سے یاد فرمایا، جس کا مطلب ہے تحمل  
 والالط کا۔

۲۔ آپ سے راہِ خدا میں قربان ہو جانے کے لئے فرمایا گیا، جس  
 پر آپ بصد شوق تیار ہو گئے (۳۶-۱۰) جس کے نتیجے میں خداوند مہربان نے آپ  
 کو محسنین میں شمار کیا۔

۳۔ آپ کو اپنی والدہ محترمہ کے ساتھ نبی بی سواہ نے گھر سے نکلوا دیا۔  
 ۴۔ آپ کے حق میں والدین بزرگوار کی دعا اور والدہ مکرمہ کی فریاد قبول  
 ہوئی، اور ہر قسم کی قبولیت کے معنی آپ کے مبارک نام "اسماعیل" میں موجود  
 ہیں، کیونکہ فرشتہ نے عبرانی میں کہا: شماری ایل "شماری (سماع = سننا) ایل  
 (خدا) کے لفظی معنی ہیں خدا کا سننا۔

۵۔ جناب اسماعیلؑ نے اپنے عظیم باپ کے ساتھ تعمیر بیت اللہ کی  
 سعادت حاصل کر لی۔

۶۔ مقدس باپ بیٹے سے اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کی صفائی و  
 پاکیزگی کا عہد لیا (۱۲۵) اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کچھ آگے چل کر اپنے  
 والد محترم کے جانشین ہونے والے تھے۔

۷۔ حضرت اسماعیل اپنے عالی قدر باپ کی کئی دُعاؤں میں ساتھ تھے، خاص کر ایسی دُعاؤں کی بات ہے، جو ان دونوں مُقَدِّس ہستیوں کی نسل اُتارنے کے عروج و ارتقاء کے لئے خاص تھیں، پس یہی وجہ ہے کہ آپ کی نسل سے حضورِ انور کا ظہور ہوا، اور اُتارنے مستقر کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے چلتا رہا۔

سوال ۷۷: امامِ مستقر پر امامِ مستودع کس طرح حجاب ہوتا ہے؟ کیا ایک امام دوسرے امام کیلئے پرے کا کام دے سکتا ہے؟ اگر یہ درست ہے تو اسمائے الہی اور سنتِ خدائی کی کوئی مثال پیش کر کے ثابت کیا جاتے۔

جواب: اس بارے میں خدا کے ناموں سے ثبوت یہ ہے کہ جہاں اللہ پاک کا ایک اسم ”الظاہر“ ہے وہاں اس کا دوسرا اسم ”الباطن“ ہے، چنانچہ الظاہر امامِ مستودع کی دلیل ہے، اور الباطن امامِ مستقر کی دلیل اور خدا کی سنت و عادت سے اس حقیقت کا ثبوت یہ ہے کہ وہ سببِ شانہ، جب کسی بشر سے کلام کرتا ہے، تو اس وقت حجاب کے پیچھے سے کلام کرتا ہے، اور جب اشارہِ مُخاص (روحی خاص) کرنا چاہتا ہے، تو اُس حال میں ظہور فرما ہو جاتا ہے (۱۶/۲۸) اس کے علاوہ قرآن کی مثال یہ ہے کہ اس کے الفاظ و کلمات معانی پر حجاب ہیں اور تنزیل پر وہ ہے تاویل پر، نیز مثال حجاب ہے مثنوی کا، حالانکہ یہ ساری چیزیں خود قرآن ہی ہیں، اسی طرح ایک اعتبار سے امامِ خود اپنے آپ کا حجاب ہے، یعنی حقیقی نور پر وہ جسم کے اندر پوشیدہ ہے، جیسے سورج کے ظاہر میں باطن چھپا ہوا ہے۔

سوال ۷۸: اس موضوع کا عنوان ہے ”روحِ اسلام“ اس سے

اسلام کی کونسی چیز مُراد ہے؟ آیا دینِ اسلام کی واقعی کوئی زندہ رُوح موجود ہے؟  
یا اس سے دین کے وہ اساسی اُمور مراد ہیں، جو انتہائی اہم ہوا کرتے ہیں؟  
اور جو دین کے جوہر کا درجہ رکھتے ہیں؟

جواب: دین کے اساسی اور انتہائی اہم اُمور کی اہمیت اپنی جگہ  
دُرست ہے، کیونکہ وہ دین کے جوہر ہی ہیں تاہم اسلام کی ایک حقیقی رُوح  
بھی ہے، جو زمانہ آدمؑ سے اس طرف چلی آئی ہے (۲۸، ۱۵) وہ رُوح بھی  
ہے اور نور بھی (۲۲) وہ ہمیشہ آسمانی کتاب کے ساتھ ہے (۱۵) کیونکہ یہ  
اس کی جان ہے، یہ یہ ہے کہ کتاب مُنیر دینِ خدا کی رُوح اور نور ہے (۲۲، ۳۱، ۱۸، ۱۸)  
(۲۵، ۳۱) یہ دُرست ہے کہ رُوح اسلام کا ایک خاص نام سراجِ مُنیر ہے (۳۳)  
اس میں کوئی شک نہیں کہ ہادی برحق کا نور ہی رُوحِ اسلام اور نورِ اسلام ہے (۲۸)

یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ دین جیسا ایک شریف ترین امر جمادات کی طرح  
بیجان ہو، یا اُس میں حیوان کی طرح ایک ادنی رُوح ہو، یا اس میں ایک عالم  
انسان کی رُوح ہو، چنانچہ یہ ایک قرآنی حقیقت ہے کہ دین کی رُوح سب  
سے اعلیٰ ہے، اور اس کے ناموں میں سے ایک نام "رُوح الایمان" ہے  
یہ وقت آنے پر دل میں داخل ہو جاتی ہے (۲۹) جس سے دل روشنوں  
کی دُنیا بن جاتا ہے (۲۹)، پس دین میں نہ صرف رُوحِ اعظم ہے بلکہ عقلِ کامل  
بھی ہے، اور وہ اسی رُوح و نور سے الگ نہیں۔ الحمد للہ رب العالمین۔

عَلَمٌ غَلَامَانِ اِمَامِ زَمَانٍ

نصیر الدین نصیر ہونزاتی

## رُوح اور سائنس

عنوان بالا کا مقصد یہ ہے کہ رُوح کے چند حقائق و معارف سائنسی مشاہدات کی روشنی میں پیش کئے جائیں، اور علم رُوح کی مدد سے سائنس کا تجربہ کر کے دیکھا جائے کہ اس کی طاقت کا بنیادی اور اصل سرچشمہ کیا ہے؟ رُوح اور سائنس (یعنی مادہ) کے درمیان ربط و رشتہ کیا ہے؟ ان دونوں چیزوں کے مابین کوئی حدِ فاصل ہے یا نہیں؟ اگر نہیں (یا ہے) تو کس طرح؟ آفاق و انفس کی آیات کیا ہیں؟ معرفتِ رُوح کے سلسلے میں سائنسی تمثیلات کس حد تک مُمد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں؟ آیا قرآنِ حکیم میں سائنس سے متعلق کوئی واضح تذکرہ یا کوئی سیکمانہ اشارہ موجود ہے؟ نزولِ قرآن کے ساتھ ساتھ مستقبل کے جن عظیم انقلابات کی پیش گوئی کی گئی تھی، ان میں کہاں یا کس میں سائنسی انقلاب کا اشارہ موجود ہے؟ کیا فرشتوں اور رُوحوں کے نزول کو سب لوگ دیکھ سکیں گے؟ ان جیسے سوالات سے یہاں بحث کی گئی ہے، کیونکہ آج کی دُنیا میں منشا تے قدرت کے مطابق جیسے بعض صحیح اور مُفید علوم و فنون

اور کمال پر ہیں، اور جس طرح سائنسی عجائبات و غرائب کا دور دورہ ہے، اس کی بدولت یہ بات پہلے سے کہیں زیادہ آسان ہو گئی ہے کہ رُوح و روحانیت کے بارے میں سوچا جائے، اس حقیقت انکار کی کوئی گنجائش نہیں کہ اب سے تقریباً پچودھ سو سال قبل آفاق و انفس کی جن آیات کے ظہور کی پیش گوئی کی گئی تھی (۱۳۵)، ان میں سے آفاقی آیات یعنی سائنسی عجائبات نے دُنیا میں رُوما ہوتے ہی ایک ظاہری اور مادی قیامت برپا کر دی ہے اور جب اس پیش گوئی کے دوسرے معجزات یعنی رُوحانی عجائبات و غرائب ظاہر ہوں گے، تو اس رُوحانی انقلاب یا قیامت سے اسواں جہان بدیہ انتہادگر گون ہوں گے۔

قیامت انفرادی ہو یا اجتماعی، جیتے جی ہو یا جسمانی موت کے بعد بہر کیف اس کو اپنے وقت پر آنا ہی ہے، لہذا ہر مومن کی دانشمندی اس بات میں ہے کہ وہ اس کے لئے خود کو اسکا خداوندی کے مطابق تیار کر رکھے، خود شناسی اور خدا شناسی کی طرف بھرپور توجہ دے، اور تین مقامات کی آیات میں غور و فکر کرے، اس سلسلے میں سب سے پہلے قرآن حکیم سے رجوع اہل ایمان کی بہت بڑی سعادت ہے، پھر قرآن پاک ہی کے بہت سے ارشادات کے بموجب آفاقی آیات میں تدریجاً حاکم آتا ہے، تاکہ فطرت کے اندر جس طرح قاطر (یعنی خالق) کی نشانیاں پوشیدہ ہیں، اور جیسی اس کی صفات کی طرف نشاندہی کی گئی ہے، اس سے آگہی ہو، چنانچہ یہ حقیقت سب کے نزدیک مسلمہ ہے کہ سائنس مطالعہ قدرت اور مشاہدہ

فطرت کی پیداوار ہے، پھر اس کے کامیاب اور مفید پہلو کو ہم کس طرح نظر انداز کر سکتے ہیں، جبکہ یہ خدا کی نشانیوں اور نعمتوں میں سے ہے (۲۱، ۲۰، ۲۱)۔

آیات کا تیسرا مقام عالم نفسی (یعنی عالم روحانی) ہے، جس سے روح و روحانیت مراد ہے، جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ عوالم یعنی دنیا میں تین ہیں، عالم دین، عالم ظاہر، اور عالم شخصی، ان میں سے ہر ایک بجائے خود اللہ کی ایک مکمل کتاب ہے، اسی وجہ سے ان تینوں میں آیات ہیں، آیت کے معنی نشانی بھی ہیں اور معجزہ بھی، پس عالم دین یعنی قرآن حکیم میں جو کچھ الفاظ و معانی میں ساکن اور یکجا ہے، وہ کائنات میں متحرک اور پھیلا ہوا ہے، اور عالم شخصی میں زندہ اور مجموع ہے۔

قرآن حکیم کے عظیم معجزات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے ظاہر و باطن کے وسیع معنی میں ہر چیز کا بیان کرنے والا ہے (۱۸، ۱۹) اور اس حقیقت کو عملاً دیکھنے کے لئے نور ہدایت کی روشنی چاہیے (۱۵) اگر وہ روشنی حاصل ہے تو اللہ تعالیٰ کی اس پر حکمت کتاب میں ہر چیز کا ضروری بیان موجود ہے، چنانچہ سائنس جیسی برہمی اہم چیز اور اس کے انقلاب کا اشاراتی تذکرہ نہ صرف بہت سی پیش گوئیوں میں فرمایا گیا ہے، بلکہ اس کے علاوہ اور بھی کئی عنوانات ہیں، جن کے تحت سائنسی ایجادات کی طرف تبلیغ و رسا اشارے کئے گئے ہیں، مثال کے طور پر خدا تعالیٰ کا بار بار یہ اشارہ فرمانا کہ تم اس کائنات کی ہر چیز میں غور و فکر کرو، اس ہدایت میں انسان کی سعادتِ داریں پوشیدہ ہے، کیونکہ اس حکم کی تعمیل میں مادہ اور روح

دونوں کی حقیقت جاننے کا امکان ہے، یعنی اس مطالعہ قدرت (NATURE) (STUDY) میں ایک طرف سائنس سے آگہی کا فائدہ ہے اور دوسری طرف حصول معرفت کا۔

سورۃ انفعال کے ایک ارشاد (۶۰) میں اسلام کی حفاظت و مدافعت کی تیاری کے سلسلے میں جس بجا معیت کے ساتھ حکم دیا گیا ہے، اس سے یہ حقیقت روشن ہو کر سامنے آتی ہے کہ آسمانی تائید کی بدولت جو بھی مادی قوت ممکن ہے، وہ سب سے پہلے اور سب سے اعلیٰ درجے پر مسلمانوں کے پاس ہونی چاہئے، پس ظاہر ہے کہ ایسی طاقت کی تحصیل صرف سائنسی ایجادات ہی کی صورت میں ہو سکتی ہے۔

یہاں اس امر سے بحث مقصود نہیں کہ ہم مسلمانوں نے دوسروں کے مقابلے میں سائنسی اعتبار سے کتنی ترقی و پیشرفت کی ہے، یا کس قدر پیچھے رہ گئے ہیں، اور اس کے اسباب و علل کیا ہیں، لیکن ہم سب کو اس حقیقت کی طرف توجہ دینے کی شدید ضرورت ہے، کہ سائنسی فکر و عمل کے نتیجے میں جو عجیب و غریب آلات اور ان کے گوناگون کرشمے سامنے آتے ہیں، وہ نہ صرف ظاہری اور مادی نقطہ نظر سے مفید ہیں، بلکہ ان کا سب سے بڑا فائدہ باطنی اور روحانی قسم کا ہے، وہ یہ کہ ان میں رُوح و روحانیت کی ایسی بہت سی تمثیلات و تشبیہات موجود ہیں، جن کی روشنی میں غور و فکر کر کے ہر دانشمند رُوح سے متعلق علم الیقین کو حاصل کر سکتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح ان چیزوں کو اپنی آیات کا درجہ دیا ہے، اس کی خاص غرض



یہی ہے، اور آیات کے معنی یہاں معجزات ہیں، جیسا کہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

سَنُرِيهِمْ اِلْتِنَاقِيَ الْاَفَاقِ وَفِي اَنْفُسِهِمْ حَتِّاٰ  
 يَتَّبِعُوْنَ لَهُمْ اِنَّهٗ الْحَقُّ (۳۱۵)، ہم عنقریب ان کو اپنے معجزات دُنیائے  
 ظاہر میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کی جہازوں میں بھی یہاں تک کہ ان پر ظاہر  
 ہو جائے کہ وہ (یعنی خدا) حق ہے۔ اس ربّانی تعلیم میں، جو مادہ اور رُوح کی  
 حکمتوں سے مملو ہے، نہ صرف امروز کی سائنسی ترقی کی پیش گوئی اور فردا کے  
 رُوحانی انقلاب کی خوشخبری ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ اشارہ بھی ہے  
 کہ پہلے پہل سائنسی معجزات کا ظہور ہوگا، اور اس کے بعد رُوحانی معجزات  
 کا دور آئے گا، تاکہ لوگ ان ظاہری و باطنی عجائبات و غرائب کے سلسلے  
 میں غور و فکر کرتے ہوئے خود شناسی اور خدا شناسی کی سعادت حاصل  
 کر سکیں۔

یقیناً رُوح عالم امر (یعنی کلمہ کُن) سے ہے، اس لئے وہ بحقیقت  
 بے مثال ہے، تاہم اس مادی دُنیا میں بقدر امکان کوئی ایسی ظاہری چیز  
 رُوح کی مثال ہو سکتی ہے، جو بہت سی اعلیٰ خصوصیات کی وجہ سے مادیت کی  
 چوٹی پر ہو، جو سب سے لطیف، سریع الحُرکت، اور ہمہ رس ہو، جس میں  
 ایک طرف وحدت اور دوسری طرف کثرت کا نمونہ پایا جاتے، جو رُوح  
 کے گونا گون ظہورات کی مثال کو پیش کر سکے، جو دکھائی دے اور نہ دکھائی  
 دے، جو جسم کو چھوڑ کر اس کی صورتِ لطیف کو پیش کر سکے، جس میں ہر قسم  
 کی آواز اور گفتگو محفوظ ہو سکے، جس کے ذریعہ دُور دُور بیٹھے ہوئے لوگ

آپس میں گفت و شنید کر سکیں، جو بلندیوں میں اُڑتا اور اُڑتا پھرتے، جو زندہ چیزوں کی متحرک عکاسی کرے، اور ان کے ماضی کو حال بناتے، جو سمعی اور بصری اشیاء کی ایک کائنات کو بناتے، جو باغ و گلشن کے حسین منظر کو سدا بہار محفوظ کر لے، جو ذرّہ بے مقدار کو آفتاب بنا کر اور آفتاب کو ذرّے کے مشابہ کر کے دکھاتے، اور جو ہر اعتبار سے عجائب و غرائب اور علم و فن کی ایک ایسی جدید دنیا ہو، کہ قبلاً اس کی کوئی مثال نہ ملے، جی ہاں، یقیناً ایسی انتہائی عجیب شے سائنس ہے، جس میں دوسری مادی چیزوں سے بڑھ چڑھ کر، اور بڑی عمدگی کے ساتھ رُوح کی مثالیں موجود ہیں، پس اہل دانش پر واجب ہے کہ وہ اس میں چشم بصیرت سے دیکھیں کہ دراصل یہ اللہ تعالیٰ کے اُن معجزات میں سے ہے، جن کے دکھانے کی پیش گوئی نزولِ قرآن کے زمانے میں کی گئی تھی، اور ان کا اعلیٰ ترین مقصد رُوح شناسی ہے، جس میں خدا شناسی ہے۔

”رُوح اور سائنس“ کے اس اہم ترین موضوع کے سلسلے میں

یہ ایک بنیادی سوال سامنے آتا ہے کہ آیا رُوح اور مادّہ حقیقت میں دو الگ الگ چیزیں ہیں؟ اگر کہا جاتے کہ ہاں، تو پھر سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان حدّ فاصل کیا ہے یا کون سی شے ہے، جو ان دونوں چیزوں کو ایک دوسرے سے قطعاً جُدا کر دے؟ کیا اس کے برعکس یہ ممکن ہے کہ ان دونوں کا رشتہ وجودِ ر یعنی ہستی کا دھاگا، ہمیشہ اور ہر مقام پر متصل اور اٹوٹ ہو؟ اس کے بارے میں میری

گزارش یوں ہے کہ رُوح اور جسم یعنی مادہ اگرچہ ظاہراً الگ الگ دو چیزیں ہیں لیکن بحقیقت یہ ایک ہی چیز ہے، جس کی یہ دو صورتیں ہیں، وہ واحدی و بَدُو (ہستی) ہے، اور اس کی یہ دونوں شکلیں تحلیل و انجذاب کے نام سے ہیں، اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ پتھر ہو یا لوہا، جو منجمد ہونے کی وجہ سے جماد کہلاتا ہے، اس کی تحلیل نباتات، پھر حیوانات، پھر انسان میں ہو سکتی ہے، اور ان کی تحلیل انسان میں براہِ راست بھی ہو سکتی ہے، اس کی ایک دُشَن دلیل یہ ہے کہ بعض مُقَدّی غذاؤں کا ایک اہم عنصر فولاد ہوتا ہے، نیز نہ صرف یونانی طب میں، بلکہ ڈاکٹری میں بھی بعض دواؤں میں فولاد ملا دیا جاتا ہے، اسی طرح بعض خاص پتھروں اور اُن جیسی جامد چیزوں کو بھی بطور دوا استعمال کرتے ہیں، اس کے یہ معنی ہوتے کہ پتھر اور لوہے کی تحلیل سب سے پہلے رُوح حیوانی کی صورت میں ہو جاتی ہے اور اس کے بعد رُوح انسانی میں۔

ہم اس اصول کو تسلیم کر لیتے ہیں کہ ہر قسم کے مادہ میں کوئی نہ کوئی رُوح پنہاں ہوا کرتی ہے، مثلاً بیدار و متحرک رُوح، نیم بیدار (نیم خواب) خوابیدہ، نیم مُردہ، مُردہ، نیم منجمد، منجمد رُوح، وغیرہ، تاکہ کارخانہ قدرت چلتا رہے، اور نظام کائنات و موجودات قائم ہو۔

اس سلسلے کی وجہ آریہ مبارکہ جو کلیدی حکمتوں سے مملو ہے، یہ ہے: **قُلْ كُونُوا سَجَارَةً أَوْ حَدِيدًا (۱۷۰)۔** ان سے کہو ”تم پتھر ہو جاؤ یا لوہا۔“ اس ارشاد میں کیا کیا حکمتیں پوشیدہ ہیں؟ کیا اس امر کا تعلق

آسمان سے ہے یا زمین سے؟ یاد دہانوں سے ہے؛ کیونکہ پتھر اور لوہا دونوں جگہ موجود ہیں، بہر حال جب اللہ تعالیٰ نے چاہا، اور اپنے رسولِ کریمؐ کی زبانِ پاک سے گونوا "فرمایا تو یقیناً ان لوگوں کے ذراتِ روح پتھر یا لوہا بن گئے، جیسے سورہ بقرہ (۲۵) میں ارشاد ہے: ... كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ (۲۵) اور اپنی قوم سے ان لوگوں کی حالت تو تم بخوبی جانتے ہو جو شنبہ کے دن اپنی حد سے گزر گئے تو ہم نے ان سے کہا کہ تم ذلیل بندر بن جاؤ۔ یہ لوگ بنی اسرائیل میں سے تھے، جنہوں نے سینچر کے دن مچھلیوں کا شکار کر کے نافرمانی کی تھی، اللہ تعالیٰ کا ان سے یہ فرمانا کہ تم ذلیل بندر بن جاؤ۔"

حضرت داؤد علیہ السلام کی زبان کے توسط سے تھا (۷۸) اور اس امر کے بموجب ان لوگوں کے ذراتِ روح بندر بن گئے تھے، مذکورہ دونوں مثالوں سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ ہادی زمانِ خدا کی زبان ہوا کرتا ہے۔

سورہ لقمان (۳۱) میں ارشاد ہے: يَلْبَسُنَّ اِنَّهَا اَنْ تَلْكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يٰۤاَيُّهَا اللّٰهُ (۳۱)، اور لقمان نے کہا تھا، بیٹا اگر کوئی چیز رات کی گداز برابر بھی ہو پھر وہ کسی چٹان کے اندر ہو یا آسمانوں میں یا زمین میں کہیں چھپی ہوئی ہو اللہ اسے نکال لاتے گا، یہ آسمان زمین کی ہر ہر چیز میں ذرہٴ روح موجود ہونے اور انفرادی قیامت میں ایسے تمام ذرات کے محشور ہونے کی ایک مثال ہے۔

اس وسیع و معرین کائنات کی ایک عظیم الشان روح ہے، جس کے

کئی نام ہیں، جیسے کرسی خدا (۲۵۵)، نفس واحدہ (۳۱، ۹۸)، جنت (۳۳۳)،  
 روح محفوظ (۲۲)، روح قرآن (۵۲)، سماء (آسمان، ۶)، نفس کلمی، روح  
 ارواح، روح اعظم، عالمیگر روح یا کائناتی روح، وغیرہ، یہ نکتہ انتہائی اہم  
 ہے کہ ہم سب کرسی یعنی کائناتی روح کی شکل کا تصور کریں، کہ کرسی کائنات اور  
 اس کی ہر چیز کے ظاہر و باطن سے وابستگی کی وجہ سے کائنات ہی کی طرح گول  
 ہے، یعنی عالمیگر روح کا سمندر، جس میں دنیائے ظاہر ڈوبی ہوئی ہے، گول  
 شکل رکھتا ہے، مگر اب یہ جاننا باقی ہے کہ کائنات بجز روح میں کس طرح نزع  
 ہو گئی ہے؟ کیا اس پتھر کی طرح جو پانی میں ڈوب جاتا ہے؟ نہیں نہیں،  
 کیونکہ پتھر تو بے شک پانی میں ڈوب جاتا ہے، مگر اس کے باطن میں پانی  
 داخل نہیں ہو سکتا، اس کے برعکس جہاں سارا عالم روح کے سمندر میں  
 مستغرق ہے، وہاں ہر ذرہ ظاہراً و باطناً روح کی لپیٹ میں ہے، جس  
 طرح مٹی کی کوئی ایسی اینٹ جو پانی میں ڈالی گئی ہو، اور اس کے ظاہر و  
 باطن میں پانی ہی پانی چھا جاتے، یا اس مثال کو یوں سمجھ لیں کہ لوہے کا  
 ایک بڑا سا گولہ ہے، جس کو لوہار نے بھٹی میں سرخ انگار بنا دیا ہے، اب  
 آپ ہی بتائیے کہ اس گولے کے ہر ذرے میں آگ ہے یا نہیں؟ اور تمام  
 گولہ کس طرح آگ میں ڈوب گیا ہے؟ اس مثال سے یہ حقیقت روشن ہو کر  
 سامنے آتی، اور ذرا بھی شک باقی نہ رہے کہ آسمان زمین میں ہر طرف، ہر جگہ،  
 اور ہر چھوٹی بڑی چیز کے اندر باہر روح محیط ہے۔

اگر روح کا تصور جسم مادہ کے بغیر کیا جائے، تو اس حال میں یہ

کہنا درست نہیں ہوگا کہ رُوح کا سمندر گول ہے، یا کسی اور شکل کا ہے؛ کیونکہ رُوح پر، جبکہ مُجَرَّد ہو، ابعادِ ثلاثہ (طول، عرض، عُقْم) کا اطلاق نہیں ہوتا ہے، مگر جہاں اس کی وابستگی عالمِ جسمانی سے ہے، وہاں یہ بات حقیقت ہے کہ رُوح کُلّی کا سمندر اس کائناتِ ظاہر ہی کی طرح گول ہے، اور یہی سمندر جو بحرِ رحمت ہے بہشت بھی ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم نے فرمایا کہ جنت کی عرض (چوڑائی، یعنی وسعت) کائنات کی عرض کے برابر ہے (۱۳۳، ۷۱)۔

سوال: آپ نے کہا کرسی یعنی عالمِ کبر رُوح جو بحرِ رحمت بھی ہے اور جنت بھی، اس کی شکل اس کائنات کی طرح گول ہے، لیکن ہم کو کیسے یقین آئے کہ عالمِ ظاہر یعنی یہ مادی کائنات گول ہے؟ کیا آپ اس سلسلے میں کوئی ٹھوس دلیل پیش کر سکتے ہیں؟

جواب: دلیل ۱: جب خداوند تعالیٰ نے فرمایا کہ جنت کی عرض (چوڑائی، ۱۳۳، ۷۱) آسمان و زمین یعنی کائنات کی چوڑائی کے برابر ہے، تو اس میں اُس دانائے مطلق نے بہشت کی لمبائی اور گہرائی کا کوئی ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ وہ بھی اور یہ جہاں بھی گول ہے، اور گول چیز کی جو کچھ چوڑائی ہوتی ہے، وہی اس کی لمبائی بھی اور گہرائی بھی شمار ہوتی ہے یہی سبب تھا، کہ خدائے علیم و حکیم نے جنت اور کائنات کی صرف عرض کا ذکر فرمایا، اور طول و عُقْم کے بارے میں کچھ ارشاد نہیں کیا گیا، پس اس دلیل سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ کائنات اور عالمِ کبر رُوح کی شکل گول ہے۔

دلیل ۷۲: اس کائنات کا ہر سیارہ اور ستارہ جب وجود میں آیا، تو وہ گول شکل میں تھا، اور اب بھی ایسا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ گول کائنات کی گول حرکت کے زیر اثر پیدا ہوا ہے، نیز ان میں سے ہر ایک جس طرح ایک دائرے میں گردش کرتا ہے، اس کا سبب بھی یہی ہے، کہ وہ کائناتی گول گردش کے دھکے میں ہے (۳۱/۳، ۳۲/۳)

دلیل ۷۳: سورج کا سرچشمہ جو کائنات کے مرکز یعنی وسط میں واقع ہے وہ ہر طرح سے گول ہے، یہ روشن گیس کی ایک بہت بڑی طوفانی دنیا ہے، جہاں عالمگیر روح کے دباؤ سے ایٹھر (ETHER) کی تحلیل ہو کر روشنی کا انتہائی عظیم ذخیرہ بن جاتا ہے، اور اس کی شکل گول اس لئے ہے، کہ یہ گول کائنات اور گول عالمگیر روح کی گول گرفت میں ہے۔

دلیل ۷۴: کائنات کی جو اصل ہے، اس کا تصور مُدَوَّر (گول) ہے، اور وہ اصل لُو لُو تے مکھنوں ہے، جس سے کائنات پیدا کی گئی ہے، اور جب جب اللہ تعالیٰ اپنے دستِ قدرت میں کائنات کو لپیٹ لیتا ہے تو اس کے نتیجے میں پھر وہی لُو لُو حاصل آتا ہے (۳۹/۴، ۱۰۶/۱) پس ان دلائل سے اس حقیقت کا کامل اور مکمل یقین ہو گیا کہ کائنات یعنی جسمِ کُلّی پوری طرح گول ہے۔

جس طرح پانی مختلف حالتوں میں پایا جاتا ہے، جیسے سمندر، بخارات، بادل، برف، بارش، بھینم، بخ، چشمہ، گنواں، کاریز، نہر، ندی، دریا، وغیرہ، اسی طرح فرشتہ ہو یا روح، اس کے مختلف حالات و درجات ہوا کرتے

ہیں، مثال کے طور پر وہ ایک عقلی نور ہے، وہ ایک روحانی صورت ہے، وہ ایک جامع الجوامع کلمہ ہے، وہ ایک نورانی آواز ہے، وہ ایک روشنی ہے، وہ ایک لطیف بشری ظہور ہے، وہ ایک صاعقہ دکڑکنے اور زمین پر گرنے والی بجلی ہے، وہ ایک رعد ربادل کی گرج ہے، وہ ایک برق آسمانی بجلی ہے، وہ ایک مجموعۂ ذرات ہے، وہ ایک تجلی ہے، وہ ایک علمی دنیا ہے، وہ ایک بہشت ہے، اور اس کی کم سے کم شعاعوں کا ادراک حسین توفیق، نیک خیال، اور ایجادی و فنی سمجھ بوجھ کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ قرآن پاک کا ارشاد ہے :-

فَاَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (۹۱/۸) پھر اس یعنی جان کی بدکرداری اور پرہیزگاری (دونوں باتوں) کا اس کو الہام کیا۔ سب لوگ اس حقیقت کو قبول کرتے ہیں کہ بڑے خیالات شیطان سے ہیں، پھر دوسری طرف سے بھی اسی طرح ماننا ہو گا کہ اچھے خیالات فرشتے کے توسط سے ہیں، اس کا نتیجہ بڑی صفائی کے ساتھ یہ نکلا کہ ساتسدا انوں نے غورو فکھ کے بعد جو کچھ دنیا والوں کو دیا، وہ دراصل خزان الہی میں تھا، جسے خُدا تعالیٰ نے فرشتوں اور رُوحوں کے ساتھ نازل فرمایا، اور اُن سے ساتس و الوں نے غیر شعوری کیفیت میں یہ ساری چیزیں حاصل کر لیں۔ وہ بابرکت شب قدر جو ہر سال رمضان المبارک میں واقع ہوتی ہے جس میں جملہ امور سے متعلق فرشتوں اور رُوحوں کا نزول ہوتا ہے، لیکن جو کچھ لایا جاتا ہے اور جو کچھ دیا جاتا ہے، اس سے کوئی شخص آگاہ نہیں



ہوتا، یہ علامت اور مثال ہے، اور اس کا مَثَل ”دُورِ شَبِ قَدْر“ ہے، جو بہت ہی عظیم ہے، اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ سب سے مُبارک رات اُپھی ہے اور زُورِ ملائکہ و ارواح بھی ہو چکا ہے، تو کیا خُدا تعالیٰ کے نزدیک یہ بات ضروری ہے کہ اس واقعہ کی خیر سب لوگوں کو ہو؟ جب کہ رات کی تاویل باطن پوشیدگی اور رُوحانیت ہے؟ اور فرشتوں نے بادلوں کے اوٹ میں اُترنا تھا۔ (۲۵)، (۲۵)؛ مگر ہاں، یہ صحیح ہے کہ اس عظیم الشان رُوحانی انقلاب میں جن امو کا تعلق دُنیا تے ظاہر سے ہے، ان کی مادی صورتیں ظہور پذیر ہوتی جا رہی ہیں، اور یہی چیزیں سائنسی ایجادات کہلاتی ہیں۔

اگر آج نہیں تو کل ضرور یہ راز سائنسدانوں پر روشن ہو جائے گا کہ سائنس رُوحانی انقلاب کا پیش خیمہ ہے، اور یہ سارے اکتشافات ایک عظیم الشان آسمانی پروگرام (PROGRAMME) کے تحت ہوتے جا رہے ہیں، تا آنکہ اسرارِ روح و رُوحانیت ظاہر ہونے لگیں گے، اور اللہ تعالیٰ کے ارشادات کے مطابق دُنیا میں سب سے بڑی تبدیلی و نوا ہو جائے گی۔

سائنس کا سارا نظام ”رُوحِ مُسَخَّر“ پر قائم ہے، جیسا کہ سورۃ جاثیہ (۴۵) میں ارشاد ہوا ہے: اور اُس نے آسمانوں اور زمین کی ساری چیزوں کو تمہارے لئے مُسَخَّر کر دیا، سب کچھ اپنے پاس سے۔ اس سے ارواحِ سماوی و ارضی کی تیخیر مراد ہے، کہ ظاہراً سائنسی نتائج و ثمرات کی صورت میں ہے اور باطناً رُوحانی سلطنت کی شکل میں۔

سورۃ حجر (۱۱۱)، میں ارشاد فرمایا گیا ہے: **وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا**  
**عِنْدَنَا خِزْيَانَةٌ، وَمَا نُنزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ (۱۱۱)**  
 اور کوئی چیز اس قانون سے باہر نہیں مگر اس کے خزانے ہمارے پاس  
 ہیں اور ہم اس کو نازل نہیں کرتے ہیں مگر دانستہ مقدار میں۔ اس آیت  
 مبارکہ میں بار بار غور و فکر کرنا چاہیے تاکہ اس سے بیش از بیش علمی برکتیں  
 حاصل ہو جائیں، چنانچہ ہم سب سے پہلے **عِنْدَنَا** کے بارے میں  
 سوچتے ہیں کہ **عِنْدِي** (میرے پاس) کی جگہ **عِنْدَنَا** (ہمارے پاس)  
 کیوں فرمایا گیا ہے؟ اس میں کیا راز ہے؟ دوسرا سوچنا یا پوچھنا یہ ہے  
 کہ ایک چیز کے کئی خزانے کیوں ہیں؟ ایک خزانہ کیوں نہیں؟ تیسرا سوال  
 ہے کہ اس آیت **مُقَدَّر** کے مطابق کوئی چیز کب دُنیا میں نازل ہوتی ہے؟  
 کیا ہر زمانے میں اور ہر وقت؟ یا یہ کسی خاص زمانے کی بات ہے؟ اور  
 چوتھا سوال یہ ہے کہ دانستہ مقدار سے کیا مراد ہے؟ آیا اس میں علم الہی  
 کا ذکر ہے یا انسانی معلومات کا؟ یا دونوں کا تذکرہ ہے؟

اس سلسلے میں میری انتہائی عاجزانہ گزارش یہ ہے کہ اس آیت حکمت  
 آگین کی ایک تاویل کتاب ”گنج گرامیہ“ میں موجود ہے، یہاں ایک اور  
 تاویل بیان کی جاتی ہے، کہ **قَدَر** حکیم میں جب اللہ تعالیٰ کی وحدانیت  
 کا کوئی ذکر مقصود ہوتا ہے، تو اُس میں لازمی طور پر ہمیشہ ذاتِ یکتا کے  
 لئے ضمیر واحد آتی ہے، لیکن جس وقت کسی خُدائی فعل کا تذکرہ کرنا ہوتا  
 ہے، تو اُس صورت میں اکثر ضمیر جمع استعمال کی جاتی ہے، اس کی وجہ یہ

ہے کہ باری سبحانہ کے لئے جس طرح امر خاص ہے، اس طرح فعل خاص نہیں کیونکہ وہ بادشاہ مطلق ہے، لہذا اس کے حکم کے تحت عظیم فرشتے یعنی قلم، لوح، اسرافیل، میکائیل، جبرائیل، نوہوت، اور نور امامت کام کرتے ہیں، چنانچہ خدائے پاک برتر نہ صرف ان فرشتوں کے اس کام کو اپنی ذات اقدس سے منسوب کر لیتا ہے، بلکہ خود ان پاکیزہ ہستیوں کو بھی اپنا نیت سے سرفراز کر کے فرماتا ہے کہ: "یہ کام ہم نے کیا" یہی حقیقت مذکورہ بالا آیت میں موجود ہے، سو اللہ تعالیٰ نے لفظ "عندنا" میں اپنے زندہ خزانوں کو اپنایا ہے، اور ان کے قرب کو اپنے قرب کا درجہ دیا ہے، ورنہ مکان و لامکان میں کوئی ایسی خد نہیں جس کے متعلق کہا جائے کہ خدا کی نزدیک سی ہے۔

مذکورہ چیز سے انسان مراد ہے، جس کیلئے تین بنیادی خزانے چاہئیں، یعنی عقلی، روحانی اور جسمانی، جو قلم، لوح، اور انسان کامل (پیغمبر یا امام) ہیں، دوسرے لفظوں میں یہی خزانے عالم عقل، عالم روح، اور عالم ذر کہلاتے ہیں، ان خزانوں سے حکم خدا ہر وقت چیزیں آتی رہتی ہیں، مثال کے طور پر آدمیوں کے پیدا ہونے کا سلسلہ جاری ہے، اس میں سب سے پہلے ذرہ جسم کو آنا چاہیے، پھر روح اور اسکے بعد عقل آتی ہے، ہر آنے والی چیز کی "دانستہ مقدار" میں دونوں اشارے موجود ہیں۔

مذکورہ بالا قرآنی قانون کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو گئی، کہ

موجودہ سائنس کے تینوں اجزاء: عقل، روح، اور مادہ پہلے پہل خدا کے خزانوں میں تھے، وہاں سے یہ چیزیں خداوند تعالیٰ کے علم یعنی پروگرام اور سائنسدانوں کی معلومات کے مطابق دنیا سے ظاہر ہو گئیں

تاہم اس میں شاید ایک بات سے آپ کو بڑا تعجب ہوا ہوگا، کہ مادہ جو اس کائنات میں آزاد اور بکھرا ہوا ہے، وہ اللہ کے کسی خاص خزانے میں گھیرا ہوا اور لپیٹا ہوا کیسے ہو سکتا ہے؟ ہاں یہ حیرت یا سوال ممکن ہے، مگر عالم ذر کے حقائق کے متعلق جس قدر آپ کے علم الیقین میں اضافہ ہوگا، اس قدر یہ حیرت کم ہوگی، اور جوں جوں آپ قد آنی اور روحانی حکمت سے واقف و آگاہ ہوتے جائیں گے، توں توں آپ کے سامنے یہ حقیقت روشن ہوتی جاتے گی، کہ مادہ لطیف (عالم ذر) روح قدسی اور عقل کامل یہ تینوں ایک ساتھ دستِ قدرت میں جمع و یکجا ہیں (۲۱/۱۰۴) دستِ قدرت یعنی اللہ کا ہاتھ بفرمودہ قرآن (۱۰) سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ بابرکات ہے، اور پھر حکمِ خدا آپ کے جانثیتوں میں سے ہر ایک اپنے زمانے میں دستِ خدا ہے، چنانچہ ایسے شخصِ کامل و مکمل کا ایک معجزاتی جسم لطیف ہوا کرتا ہے، جو عالم ذر کہلاتا ہے، جس کے بہت سے قرآنی نام ہیں ان میں سے چند اسماء یہ ہیں :-

سربال (کرۃ) جس کی جمع سراہیل ہے (۸۱) لبوس (پوشش، ۲۱) صابغہ (۱۳۳) رعد (۱۳۳) برق (۱۳) الکواثر (۱۰۸) جسم بسیط (۱۳۷) بشر سوتی (۱۹) وغیرہ، اس معجزاتی جسم میں نہ صرف مادی سائنس کے ہر گونہ ذرات موجود ہیں، بلکہ جسدِ ابداعی ہونے کی وجہ سے روحانی سائنس کے لاتعداد عجائب و غرائب اور معجزات بھی ہیں، مثال کے طور پر آپ نے سنا ہوگا، کہ آج کل جن

حاکم میں ظاہری سائنس کا دور دورہ ہے، وہاں فضا میں بعض دفعہ اٹن طشتریاں نظر آتی ہیں، جو ابھی تک سائنس دانوں کے نزدیک ناشناختہ چیزیں ہیں، جو حقیقت میں مادیت اور روحانیت کے سنگم پر ہیں، اور ان میں بے شمار سکھتیں پوشیدہ ہیں، اگر آپ چاہیں تو ان کے بارے میں غور و فکر کر کے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں، کیونکہ ان کا ظہور ایک انتہائی عظیم روحانی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔

ایک عظیم اور زبردست روح کس طرح عالم ذرّہ ہوا کرتی ہے، جسم لطیف یا ایٹر (ETHER) کو کس آسانی سے برقی توانائی میں تبدیل کر سکتی ہے، اور اس سے مستقبل کی روحانی سائنس کے متعلق کیا کیا امیدیں وابستہ ہو سکتی ہیں، اس کی مثال آپ یو۔ ایف۔ او (U.F.O.) یعنی اٹن طشتری سے لے سکتے ہیں، کیونکہ وہ منشائے الہی کے مطابق فعل ابداع یعنی نتایج "کنج" کا نمونہ ہے، لہذا ایک مخلوق ہونے کے باوجود سب سے، سو آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ معجزاتی گرتے ہے، یا صاعقہ اور رعد و برق ہے، یا فرشتہ ہے، یا ترقی یافتہ انسان ہے، یا بجن ہے، یا کوئی بدن ہے، یا عالم شخصی ہے یا عالم ذرّہ ہے، یا انسانِ کامل ہے، یا معجزہ قیامت ہے، یا اتانے علوی ہے، یا تحت روحانیت ہے، یا سلطنت سلیمانی ہے۔

تصیر الدین نصیر ہونزائی

۱۴۔ مارچ ۱۹۸۵ء

## معراج اور معارج

معراج کے معنی میں اُدپر چڑھنے کی چیز، بیڑھی، زینہ، نردبان رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عالمِ علوی میں نُورِ خداوندی دیکھنے کا موقع اور اس کی جمع معارج ہے، جیسے قرآنِ حکیم (۱-۴۴) میں ارشاد فرمایا گیا ہے:-

سَأَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَاقِعٍ - لِّلْكَافِرِينَ لَيْسَ لَهُ  
دَافِعٌ - مِّنَ اللَّهِ ذِي الْمَعَارِجِ - تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ  
وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ  
سَنَةٍ (۱-۴۴) ایک سائل نے ہونے والے رُوحانی، عذاب کو مانگا جس کا  
کافروں کے واسطے کوئی دفع کرنے والا نہیں، یہ اللہ کی طرف سے واقع ہوتا  
ہے جو بیڑھیوں اور معراجوں کا مالک ہے، اس کی طرف فرشتے اور رُوحِ عظیم  
چڑھ کر جاتی ہے ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار برس کی ہے۔

حکمت: (۱) یہ اصول ہمیشہ کے لئے یاد رہے کہ ہر عظیمِ خدائی بھید  
کا ایک گونہ حجاب ہوا کرتا ہے، چُنا چُنا یہاں پس پردہ ایک بہت بٹارا ز

(۲) عذابِ دراصل راہِ رُوحانیت پر واقع ہے (۱۹) مگر اسے خُدا نے  
 مہربانِ مومنین سے دفع کرتا ہے، جیسا کہ آیہ مذکورہ بالا میں اشارہ ہے۔  
 (۳) مانگنے والے نے رُوحانی ترقی مانگی تھی، وہ مومن تھا، مگر خُدا تعالیٰ  
 نے بمقتضائے حکمت اس بات پر ایک مناسب پردہ بنایا، جس کا ذکر ہو  
 چکا۔

(۴) انبیاء و ائمہ علیہم السلام خُدا تعالیٰ کی زندہ بیٹریاں (معالج)  
 ہیں، ان حضرات میں سے ہر ایک (جو رُوحِ اعظم کا درجہ رکھتا تھا) نے حکم  
 خُدا و اِراحِ مومنین کو فرشتے بنا کر اللہ کی بارگاہِ عالی تک پہنچا دیا۔

(۵) اگرچہ رُوحانیت کا یہ سفر دنیوی حساب سے ۵۰۰۰۰ (پچاس  
 ہزار) برس کا ہے، لیکن اہل ایمان کا نور جس طرح ان کے آگے اور دلہنے  
 دوڑتا ہے، اُس کی بدولت یہ مسافت کُم مدت میں طے ہو جاتی ہے (۱۲، ۱۳، ۱۴)  
 سُورۃ اعراف (۱۳۱) کے اس پُر حکمت ارشاد میں خوب غور کرنا ہے:

ان الذین کذبوا بآياتنا و استکبروا عنها لا تفتح  
 لهم ابواب السماء و لا یدخلون الجنة حتی یسلج  
 الجمل فی سم الخیاط (۱۳۱) یقین جانو جن لوگوں نے ہماری آیات کو ٹھٹھایا  
 ہے اور ان کے مُقابلہ میں بڑائی کی ہے ان کے لئے آسمان کے دروازے  
 ہرگز نہ کھولے جاتیں گے، وہ لوگ کبھی جنت میں نہ جاتیں گے یہاں تک  
 کہ اونٹن سوئی کے ناکے کے اندر سے گزر جاتے۔

حکمت: (۱) خُدا تعالیٰ کی آیات سے ائمہ و طاہرین صلوات اللہ

علیہم مراد ہیں، لہذا ان حضرات کو مجھٹلانا آیات اللہ کو مجھٹلانا ہے، اُن برگزیدہ ہستیوں کے منصب کا دعویٰ کرنا بدترین تکبر ہے۔

(۲) چونکہ آسمان سات ہیں، اس لئے یہاں رُوحانیت کے سات دروازوں کا ذکر ہے۔

(۳) اُونٹ کی تناویل یہاں آدمی کا اپنے آپ کو بڑا سمجھنا ہے، اُونٹ کا سُوتی کے ناکے سے گزر جانا یہ ہے کہ انسان حقیقی معنوں میں دین کی اطاعت کرے، اور عجز و انکساری سے اپنی مُنجد رُوح کے اُونٹ کے ذرات بنائے، اب یہ اُونٹ بونا قاصح کی طرح لطیف ذرات کی حیثیت میں ہے، وہ سُوتی کے ناکے سے گزر سکتا ہے۔

مذکورہ بالا آیت سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ معراج، معارج، اور راہِ جنت کا مطلب ایک ہی ہے، کیونکہ رُوح اور عقل کے جس اعلیٰ مقام پر خداوند تعالیٰ کا انتہائی قرب حاصل ہوتا ہے، وہیں معراج بھی ہے اور بہشت بھی، یعنی انسان کا سفر عالمِ سفلی کی پیشی سے عالمِ علوی کی بلندی کی طرف ہے، جس کی مثال سیرِ صحرای (معراج) سے دی گئی ہے، اور رُوحانیت کی سیرِ صحرای ہادی برہتی کی مبارک ہستی ہے۔

حضرات انبیاء و ائمہ علیہم السلام بحقیقت بنی آدم ہیں، کیونکہ یہی صاحبانِ اوصافِ آدم کے وارث و مالک ہیں، چنانچہ بموجب آیتِ کریمہ (۲۷: ۱) پروردگار کی سُنت یہ ہے کہ وہ ہر پیغمبر اور ہر امام کی پشت سے اس کی دُنیا کی ذریت کو دستِ قدرت میں لیا کرے، جبکہ ایسے انسانِ کامل کی ذاتی



قیامت برپا ہو جاتی ہے، اور خُدا نے ان ذراتِ روح کو اس معنی میں لیا کہ ان میں حرکت پیدا ہو گئی، اور متعلقہ شخصیت کے روحانی عروج و ارتقاء کے تحت ان کو ایک طرح کی رفعت دی گئی، جیسا کہ ارشاد ہے۔

اور جب آپ کے رب نے اولادِ آدمؑ کی پشتوں سے ان کی ذریت کو لیا اور ان کو اپنی جانوں پر حاضر کر کے گواہ بنایا کہ کیا میں تمہارا رب تمہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا کیوں نہیں۔

حکمت: (۱) عہدِ الست کا واقعہ جس میں معجزہ معراج ہے ہر کامل انسان کی روحانیت میں پیش آتا ہے، جس میں تمام اہل زمانہ بصورتِ ذرات شامل ہوتے ہیں۔

(۲) اسی طرح ربِّ کریم نے بنی آدمؑ (انبیاء و ائمہ) کو روح کا مشاہدہ کرایا اور اس کی کامل معرفت عطا کر دی۔

(۳) اُس بلندی پر لوگوں کے ذراتِ روح بھی موجود تھے، مگر غیر شعوری حالت میں۔

دُنیا کی مثال میں راہ الگ ہوتی ہے اور رہنما اس پر ہوتے ہوتے ایک الگ وجود ہوتا ہے، مگر اس کے برعکس دین میں ایک ہی شخصِ دو جہادی برحق ہے (راہ و رہنما دونوں کا کام انجام دیتا ہے، چنانچہ اس کو قرآن حکیم نے کبھی تو صراطِ مستقیم کے نام سے پکارا، کبھی ہادی کہا، کبھی نُور، کبھی معراج وغیرہ فرض جیسے جیسے اس کے بے شمار کام ہیں، ویسے ویسے اس کے بے حساب نام ہیں کیونکہ خُدا نے اس کو سب کچھ ہونے کا درجہ دیا ہے (۱۲/۳۴)

حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے وقت میں امام مستودع، صراطِ مستقیم، اور خدا کی سیڑھی تھے، جس کے چودہ زینے تھے، یعنی امام، باب، اور بارہ حُجَّت جن کی مثال قرآن پاک (۱۱۳) میں سُورج، چاند، اور گیارہ ستاروں سے دی گئی ہے، حضرت یوسفؑ نے جب یہ نورانی خواب دیکھا کہ آپ کو گیارہ ستارے، سُورج اور چاند سجدہ کر رہے ہیں، تو اُس وقت آپ بھی اس سیڑھی کے زینہ بزیریں پر ایک ستارہ یعنی حُجَّتِ اَوَّل تھے پھر حکمِ خدا زینہ بزینہ اس نردبان (سیڑھی) کی چوٹی پر پہنچ گئے، جبکہ ان کو گیارہ ستاروں اور شمس و قمر نے فعلاً سجدہ (یعنی اطاعت) کیا، اس مثال سے دین کی یہ بنیادی حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ انبیاء و ائمہ علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی جیتی جاگتی سیڑھیاں ہو کرتے ہیں۔

خداوند تعالیٰ کی سیڑھی کی دوسری مثال یہ ہے :-

۱- مُسْتَجِيب

۲- ماذونِ اصغر

۳- ماذونِ اکبر

۴- داعیِ مکفوف

۵- داعیِ مطلق

۶- حُجَّتِ جزیرہ

۷- حُجَّتِ حضورِ (مقرب)

۸- امام ۴

۹- اساس<sup>۴</sup>۱۰- ناطق<sup>۳</sup>

۱۱- نفسِ مگلی

۱۲- عقلِ مگلی

جیسا کہ ارشاد ہے :-

هُمَّ دَرَجَاتٍ عِنْدَ اللَّهِ ط  
وَاللَّهُ بِصَدْرِهِمْ عَلِيمٌ (۱۶۳)

یہ لوگ (یعنی مردِ دین) قریبِ خدا کے درجات  
ہیں، اور اللہ تعالیٰ خوب دیکھتا ہے ان کے  
اعمال کو۔

حکمت : (۱) اللہ تبارک و تعالیٰ  
کی نزدیکی کے درجات اور کہیں تہیں صرف  
صراطِ مستقیم پر واقع ہیں، بلکہ یہ خود راہ  
راست اور خدا تعالیٰ کی سیر بھی ہیں۔

(۲) آپ اس بات کو خوب جانتے  
ہیں کہ هُمْ جَرَجَاتٍ (وہ درجات ہیں،  
اور لَهُمْ دَرَجَاتٍ) ان کے لئے درجات  
ہیں<sup>۸</sup>) کے درمیان فرق ہے۔

قرآنِ پاک میں جس طرح درجہ اور

|                   |    |
|-------------------|----|
| عقلِ مگلی         | ۱۲ |
| نفسِ مگلی         | ۱۱ |
| ناطق <sup>۳</sup> | ۱۰ |
| اساس <sup>۴</sup> | ۹  |
| امام <sup>۵</sup> | ۸  |
| باب               | ۷  |
| حجرتِ جزیرہ       | ۶  |
| داعیِ مطلق        | ۵  |
| داعیِ مکفوف       | ۴  |
| ماذونِ اکبر       | ۳  |
| ماذونِ اصغر       | ۲  |
| مستعجب            | ۱  |

درجات کا ذکر فرمایا گیا ہے، وہ حد و دین کا ذکر ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:-

رَفِيعُ الدَّرَجَاتِ ذُو الْعَرْشِ يُلْقِي الرُّوحَ مِنْ  
 امْرُؤٍ عَلٰى مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادٍ لِّئِنذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ  
 (۲۴) خدا درجوں کا بلند کرنے والا ہے وہ عرش کا مالک ہے۔ اور اپنے  
 بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے رُوح ڈالتا ہے اپنے امر سے تاکہ وہ صاحبِ  
 وحی، ملاقات کے دن سے ڈرائے۔ یعنی خدا حد و دین کو اور ان کے  
 وسیلے سے دوسروں کو بلند کرتا ہے۔

حکمت: (۱) اللہ تعالیٰ جب کسی کو بلند کرنا چاہتا ہے تو مقررہ درجہ  
 کی سیڑھی سے بلند کرتا ہے، کیونکہ یہی صراطِ مستقیم ہے، اور یہی وہ سیڑھی  
 ہے جو صاحبِ عرش کی طرف رجوع کرنے کے لئے بامِ عرش تک قائم کی گئی  
 ہے۔

(۲) اسی سیڑھی پر پیغمبروں کو وحی کی زندہ روح آتی ہے، اور اس سے  
 چرطھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاص معراج کا شرف حاصل ہوا۔  
 (۳) کوئی شی نہیں، جس کے خزاآن خدا کے پاس نہ ہوں، اور  
 ان خدائی خزانوں سے جو جو چیزیں نازل ہوتی ہیں، وہ اسی سیڑھی سے  
 اترتی ہیں۔

(۴) جب پروردگار کے عظیم اور پرہکمت ناموں میں سے ایک نام  
 ذی المَعَارِج (سیڑھیوں والا ہے)، تو پھر قرآن (جس میں ہر چیز کا بیان  
 ہے) (۱۹/۸۹) میں اس کا کوئی منظم تصور ہوگا، کوئی تفصیل ہوگی، اور اس موضوع

سے متعلق کچھ آیات ہوں گی، جمی ہاں، ایسا ہی ہے، جیسا کہ یہاں اس کا کچھ ذکر ہوا، اور ہوتا ہے۔

حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ نے آیۃ مبارکہ ابرہہ سے (۱۵۶) کی طرف پر زور توجہ دلاتی ہے، اس سلسلے کی تین آیتوں کا ترجمہ یہ ہے: اور تم تمہیں کچھ خوف اور بھوک سے اور مالوں، جانوں اور پھلوں کی کمی سے سے ضرور آزمائیں گے، اور (اے رسولؐ) ایسے صبر کرنے والوں کو کہ جب اُن پر کوئی مصیبت آپڑی تو وہ (بیساختہ) بول اُٹھے ”ہم تو خدا ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں“ خوش خبری دیدو کہ انھیں لوگوں پر اُن کے پروردگار کی طرف سے دُرود اور رحمت ہے، اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں (۱۵۵-۱۵۷)

حکمت: (۱) اگر مومن عالی ہمت ہے تو ہر امتحان روح کے سٹی میں سُود مند ہو جاتا ہے، اور آزمائش کے بغیر کوئی عروج و ارتقاء نہیں۔

(۲) خُدا نے علیم و حکیم کی نظر میں انتہائی مُفید نتائج کے لئے جیسے بڑے اہم امتحانات ضروری تھے، وہ بس یہی ہیں۔

(۳) خوف دل کی ایک ایسی کیفیت کا نام ہے کہ اس میں نفس تمام دُنیاوی خیالات کو چھوڑ کر عاجز اور قابلِ رحم صورت اختیار کر لیتا ہے، ایسے میں آدمی کی مکمل توجہ خُدا کی طرف ہو جاتی ہے۔

(۴) بھوک سے نفسِ حیوانی کی اصلاح ہو جاتی ہے۔

(۵) مال و جان کے نقصان سے دل شکرنگی اور فنائیت کی کیفیت

طاری ہو جاتی ہے۔

(۶) ثمرات کے نقصان سے رُوہانیت کا نقصان مُراد ہے، غرض یہ تمام احوال بشرط دینی شعور ایسے ہیں کہ ان کی بدولت خُدا کی طرف ہنگامی اور ذاتی رجوع کرنے میں زبردست مدد ملتی ہے۔

(۷) راسخون کا مطلب... "إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ" کہنا ہے، مگر اس میں یہ جاننا ضروری ہے کہ انسان کا اصل مقام حضور الہی ہے، وہ خُدا کی میٹرھی سے اتر کر یہاں آیا ہے، پھر اسی میٹرھی سے چڑھ کر اللہ تعالیٰ کے بجز نور میں رجوع کرنا ہے۔

جس طرح اس مضمون کے شروع میں یہ ذکر ہوا کہ انبیاء و ائمہ صلوات اللہ علیہم خُدا تعالیٰ کی میٹرھیاں ہوا کرتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر پیغمبر اور ہر امام اپنے حدود کے ساتھ ایک زندہ روحانی میٹرھی کا کام انجام دیتا ہے، اور یہی شخص کامل ہادی بھی ہے، اور ہدایت بھی وہ جس طرح آسمان اور عرشِ اعلیٰ کی مثال میں معراجِ دسیٹرھی ہے، اسی طرح زمین اور خانہ خُدا کی مثال میں صراطِ مُستقیم بھی ہے، نیز وہ طوفان کی مثال میں کشتی نجات بھی ہے، کیونکہ وہ ایک ایسی ہمہ گیر حقیقت ہے کہ اس کی طرح طرح سے مثالیں دی گئی ہیں۔

نصیر سقیر

۲۔ جنوری ۱۹۸۵ء

## سُنَّتِ اِلٰہی

لفظِ سُنَّتِ مادّۂ س ن ن سے ہے، اور اس کے معنی ہیں طریقہ، دستور، عادت، اور قانُون، اور سُنَّتِ اللّٰہ سے اللّٰہ تعالیٰ کی عادت اور حکمت مُراد ہے، جیسے قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے: سُنَّتِ اللّٰہِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبْدِيلًا (۲۲۸) (یہی) خُدا کی عادت ہے جو پہلے سے چلی آتی ہے اور تم خُدا کی عادت کبھی بدلتی نہ دیکھو گے۔ نیز ارشاد ہے: وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَحْوِيلًا (۳۵) اور خُدا کے طریقے میں کبھی تغیر نہ دیکھو گے۔ یعنی اگرچہ آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم سے قبل کی شریعتیں فروعی اعتبار سے مختلف صورتوں میں چلی آئی تھیں، لیکن ان سب کا مقصد ایک ہی ہے، اور وہ ہے خُدا شناسی، اطاعت اور ابدی نجات، جو رُوحِ اسلام کے مطابق عمل کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے۔

سُنَّتِ کی جمع سُنَن ہے، اور یہ لفظ قرآنِ مُقدس میں اس طرح آیا ہے: قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا

فی الارض فانظروا کیف کان عاقبة المکذبین (۱۳۳) تحقیق تم سے قبل مختلف طریقے گزر چکے ہیں تو تم زمین میں سیر کرو اور دیکھ لو کہ تکذیب کرنے والوں کا انجام کیسا ہوا۔ لفظ "سنن" میں یہاں تمام طریقوں کا ذکر ہے، خواہ مومنوں کا ہو یا کافروں کا، اور زمین میں سیر کرنا دو طرح سے ہے یعنی سیارہ زمین پر سیاحت کرنا اور زمین رُوحانیت میں سیاحت کرنا، مگر یہاں جس زمین میں چلنے پھرنے کے لئے فرمایا گیا ہے، وہ زمین باطن ہے، جو عالم شخصی کی زمین ہے، اور کافروں کے انجام کو دیکھنے کا جو مقصد ہے، وہ صرف کسی ایسی اُجڑی ہوئی بستی پر نظر ڈالنے سے پورا نہیں ہو سکتا، جو کسی قوم کی نافرمانی کے نتیجے میں تباہ و برباد کی گئی ہو، کیونکہ جھٹلانے والوں کی عاقبت صرف ظاہری ہلاکت تک محدود نہیں، بلکہ عاقبت کا اصل مطلب رُوحانیت اور آخرت ہے، پھر اس معنوی تحقیق سے یہ پتہ چلا کہ انبیاء و اولیاء کی تکذیب کرنے والوں کے انجام (عاقبت) کا مشاہدہ مقام رُوحانیت پر ہو سکتا ہے۔

سنن کا دوسرا استعمال اس آیت کریمہ میں ہوا ہے: **يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذَيِّبَ لَكُمْ وَيُهَيِّدَ لَكُمْ سُنْنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ**

قرآن حکیم میں لفظ سنن: ۱۷، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۵، ۴۰، ۴۳، ۴۸، ۱۷، ۴۴، ان آیات کریمہ میں آپ ضرور غور کریں، اور ان کے ماقبل او مابعد کو بھی دیکھیں۔



و یتوب علیکم (۳۵)، اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے کہ تمہارے لئے بیان کرے اور تمہیں اُن لوگوں کے طریقوں پر چلائے جو تم سے پہلے گزرے ہیں اور تم پر توجیہ فرماتے۔ بیان کرنے سے تاویل مُراد ہے اور یہاں اگلے لوگوں سے انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین مُراد ہیں (۳۶)، جس طرح سورۃ فاتحہ میں تعلیم سماوی دی گئی ہے کہ: اٰھدنا الصراط المستقیم۔ صراط الذین انعمت علیہم (۵-۶) چلائیے ہم کو راہِ راست پر اُن لوگوں کی راہ پر جن پر تو نے انعام فرمایا ہے۔ اس ارشاد سے ایک طرف تو یہ معلوم ہوا کہ قبل از اسلام کی شریعتیں اگرچہ ظاہر میں الگ الگ اور مختلف تھیں، لیکن ان کا باطن ایک ہی ہے، اور دوسری طرف یہ پتہ چلا کہ جس معنی میں خدا کی سُنّت میں تبدیلی و تغیر نہیں ہے، اس کا تعلق دین کے بُنیادی اور باطنی امور سے ہے۔

ذکورۃ بالا آیات کی روشنی میں اس حقیقت کا یقین محکم ہو جاتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے دستور (سُنّت) کے مطابق ظہورِ اسلام سے پہلے اور زمانۂ نبوت میں نورِ ہدایت کو جاری رکھا تھا، اسی طرح وہی سلسلہ اب بھی جاری ہے، کیونکہ یہ امر دین کے اساسی امور میں سب سے اہم ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ بقرہ (۱۵۰)، میں اپنی نعمت کی تکمیل کا مسلمانوں سے وعدہ فرمایا، اور اسی مقام پر (۱۵۱)، اس عظیم نعمت کی نوعیت اور فوائد کا ذکر فرمادیا، اور پھر غدیرِ خم میں یہ مُکرم نازل ہوا :-

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی

ورضیت لکم الاسلام - نیا (۳۵) آج میں تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور (اس) دین اسلام کو پسند کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ دن تھا، جس میں حضور اکرمؐ نے خدائے پاک برتر کے منشا و سنت کے مطابق مولا علیؑ کو اپنا خلیفہ و جانشین اور امام بنا دیا، کیونکہ امام جب پہلے سے ہوتا چلا آیا ہے تو ختم نبوت کے بعد اس کا ہونا اور بھی زیادہ ضروری ہے، جیسا کہ فرمانِ خداوندی ہے:-

سُنَّةَ مَنْ قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا (۲۴) یہ ہمارا مستقل طریق کار ہے جو ان سب رسولوں کے معاملے میں ہم نے برتا ہے جنہیں تم سے پہلے ہم بھیجا تھا، اور ہمارے طریق کار میں تم کوئی تغیر نہ پاؤ گے۔ یعنی جس طرح دورِ نبوت میں ہدایت کا سلسلہ جاری و باقی رہے اسی طرح یہ دورِ امامت میں بھی چلتا رہے گا، اور خداوند تعالیٰ کی اس عادت میں کہ وہ ہمیشہ روتے زمین پر اپنا خلیفہ مقرر فرماتا ہے کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

آپ دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عادت ماضی، حال، اور مستقبل پر محیط ہے، اور اس میں کوئی تبدل و تغیر نہیں، چنانچہ ربِّ کریم نے اپنی عادت کے مطابق نورِ ہدایت اور کتابِ مبین کو نازل فرمایا (۱۵) کتابِ سماوی (قرآن) کے وجود کے بارے میں کسی مسلمان کو کیا شک ہو سکتا تھا، لہذا نور کے باب میں ارشاد ہوا کہ: نورِ خداوندی کو کوئی نہیں بچھا سکتا، وہ تو درخشان و تابان قائم و دائم رہے گا (مفہوم ۹، ۲۲، ۶۱، ۸)

کیونکہ نور کا آخری مقصد مومنین کی منازلِ رُوحانیت اور مراحلِ قیامت میں پہنچائی کرنا ہے (۱۲)۔

سورۃ مومن کے آخر (۱۸۵) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: سُنَّتَ اللّٰهِ  
الَّتِي قَدْ خَلَقْتَ فِي عِبَادِهِ وَخَسِرَ هُنَا لِكَافِرُونَ  
(۱۸۵) اللہ تعالیٰ کی عادت یہی ہے جو ہمیشہ اس کے بندوں میں جاری رہی  
ہے اور کافر لوگ اسی جگہ خسارے میں پڑ گئے۔ ”فی عبادہ“ کے انتہائی  
معنی ہیں اس کے خاص بندوں کے باطن یعنی رُوحانیت میں، بالفاظِ  
دیگر انبیاء و ائمہ صلوات اللہ علیہم کی ذاتِ بابرکات میں، کیونکہ کسی  
انسان کی عادت ہر چند کہ ایک جیسی نہیں رہ سکتی ہے، لیکن وہ ہر حال  
اس کی خصوصیات کے تحت بنتی ہے، مگر خدا کی عادت ہمیشہ ایک  
جیسی ہے اور وہ اللہ کے جملہ اسمائے صفات اور قول و فعل کے تحت ہے،  
جس کا ظہور سب سے پہلے منظرِ خدا کے آئینہٴ دل (رُوحانیت) میں ہوا  
ہے، پس جو لوگ اس بسترِ عظیم کو جانتے ہیں، وہ بڑے فائدے میں ہیں  
اور جو اس بھید کو نہیں سمجھتے ہیں، وہ بڑے خسارے میں ہیں۔

یہ اصولِ خدائے حکیم کی عادت میں سے ہے کہ وہ ہمیشہ کارِ ہدایت  
کے لئے خاندانِ نبوت کو برگزیدہ فرماتا ہے، جیسے اُس نے حضرت  
آدمؑ، حضرت نوحؑ، آلِ ابراہیمؑ، اور آلِ عمرانؑ کو سارے جہان  
والوں پر برگزیدہ کیا (۳۳) جیسے رب العزت نے آلِ ابراہیمؑ کو  
کتاب، حکمت اور ملکِ عظیم عطا کر دیا، اور جس طرح حضرت ابراہیمؑ

علیہ السلام نے اسی قانون کے مطابق اللہ کی اس خصوصی رحمت کے لئے دعا کی تھی کہ امامت و اقیامت آپ ہی کی نسل میں جاری رہے (۱۳۴)

سورۃ رعد (۱۳۸) میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا ایک حکمت آگین فرمان

اس طرح ہے جس سے سنتِ الہی کی ترجمانی ہوتی ہے: ولقد ارسلنا

رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَذُرِّيَّةً (۱۳۸) اور یقیناً ہم نے آپ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے اور ہم

نے انکو بیبیاں اور بچے بھی دیتے۔ لفظ ذُرِّيَّة کے معنی ہیں اولاد،

نسل، خواہ بیٹا ہو یا بیٹی، کیونکہ یہ لفظ قرآن حکیم میں بچہ اور بچی دونوں

کے لئے آیا ہے، جیسا کہ قول قرآن ہے: وَاِذَا اخَذَ رَبُّكَ

مِن بَنِي اٰحِم مِّنْ ظُهْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَسْتَدْهَم

عَلٰى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلٰى شَهِدْنَا ذٰلِكَ (۱۳۷)

اور جب آپ کے رب نے اولاد آدمؑ کی پشت سے ان کی ذُرِّيَّة کو لے لیا اور

ان سے انھیں کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں سب

نے جواب دیا کیوں نہیں ہم گواہ بنتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہاں ذُرِّيَّة

کا لفظ مرد و عورت سب کے لئے استعمال ہوا ہے، چنانچہ خدا تعالیٰ کا

آنحضرتؐ سے یہ فرمانا کہ ہم نے آپ سے قبل کے تمام پیغمبروں کو بیبیاں

اور ذُرِّيَّة دی تھی، یہ معنی رکھتا ہے کہ حضور انورؐ کا بھی خاندان اور

ذُرِّيَّة ہے، اور آپؐ کی وہ پاک و پاکیزہ ذُرِّيَّة حضرت فاطمہ الزہراء

صلوات اللہ علیہا ہیں، اور اسی عظیم تصور کے پیش نظر قرآن پاک میں

لفظ ذُرِّيَّةً کو انتہائی حکیمانہ انداز میں استعمال کیا گیا ہے، جیسے آیت - اصمطفا کے حصّۃ ذُرِّيَّةً لِعَضْبَاهَا مِنْ بَعْضِ (۳۴) میں کامل مردوں اور پاک عورتوں کی اولاد کا ذکر فرمایا گیا ہے، کیونکہ جہاں کہیں کسی ذُرِّيَّة کی اصمطفا و نجابت کی تعریف و توصیف ہو تو وہ حقیقت میں ماں باپ کی وجہ سے ہے۔

قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ۲۲ دفعہ ”ابن مریم“ کے نام سے یاد فرمایا گیا ہے، قرآن حکیم جیسی آسمانی کتاب میں اس قسم کے نام کا بار بار آنا حکمت سے خالی نہیں، چنانچہ اس میں پانچ حکمتیں پوشیدہ ہیں :

- ۱۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ جس طرح پیغمبر اور امام کے پدری رشتے کی اہمیت ہے اسی طرح مادری رشتے کی بھی اہمیت ہے۔
- ۲۔ انسان کامل کو خاندانی فضائل باپ سے بھی آتے ہیں اور ماں سے بھی۔

۳۔ اس میں یہ مثال ہے کہ ہر کامل یا ہر مریم جیسی روحانی ماں حضرت عیسیٰ جیسے روحانی فرزند کو جنم دے سکتی ہے۔

۴۔ اس میں ائمہ طہارین کے فاطمہ زہرا کے توسط سے آل محمد ہونے کا زندہ ثبوت ہے۔

۵۔ یہ خواتین کی عظمت و بزرگی کی ایک روشن دلیل ہے۔

اللہ تعالیٰ کی عادت ہر پیغمبر اور ولیٰ امر کی ذات اقدس میں گزرتی آتی ہے، اور اسی مرکز سے لوگوں پر اثر انداز ہوتی رہی ہے، آپ اس

حقیقت کی تحقیق و تصدیق قرآن حکیم کے دو موضوع سے کر سکتے ہیں، وہ ہیں ”سُنَّتِ اللّٰهِ“ اور ”قِصَّةُ اَنْبِیَاءِ“ کیونکہ جس طرح ایک آیت کی تفسیر دوسری آیت سے ہوا کرتی ہے، اسی طرح ایک موضوع کی وضاحت دوسرے موضوع سے ہوتی ہے، چنانچہ خدا کی عادت کی تفسیر و تاویل قِصَّةُ اَنْبِیَاءِ ہے، یہ تو معنی پھیلانے کی بات ہوتی، اور اگر معنی کو مرکوز کیا جائے تو پھر کہنا پڑے گا کہ انبیا و اولیاء علیہم السلام خود سُنَّتِ اللّٰهِ ہی، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی سُنَّتِ مُحَمَّدٌ ہیں۔

نوٹ: سُنَّتِ الہی کے متعلق مزید معلومات کے لئے  
ملاحظہ ہو: ”علم کے موتی“ صفحہ نمبر ۳۵

نصیر الدین نصیر ہوزائی

۴- فروری ۱۹۸۴ء

# تطہیر و تزکیہ

(۱)

تطہیر و تزکیہ کے معنی ہیں حکم خدا رسولؐ کا اہل ایمان کو ظاہر و باطناً پاک و صاف کر دینا، جیسا کہ سورۃ توبہ ۱۰۳ میں ارشاد فرمایا گیا ہے :-  
 خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا  
 وَصَلِّ عَلَيْهِمْ - إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَهُمْ (۱۰۳، ۱۰۴)  
 رسولؐ تم ان کے مالوں میں سے صدقہ (یعنی زکات) لے لو کہ اس کے ذریعے سے تم انکو ظاہر و باطن میں پاک و پاکیزہ کرو گے اور ان کو صلوٰۃ دو کیونکہ تمہاری صلوٰۃ ان کے لئے تسکین قلب ہے۔ اس آیت کریمہ میں سات اسامیٰ یعنی بنیادی حکمتیں ذیل کی طرح ہیں :-

۱۔ خُذْ (تُوپکڑ، تولے)، اُخْذْ کے مصدر سے امر ہے، اس فعل کا تعلق ہاتھ سے ہے، اور یہ خدا تعالیٰ کا حکم ہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا گیا ہے، تاکہ آنحضرتؐ مومنین سے ظاہری (مادی) اور باطنی (علمی) زکات لیا کریں، کیونکہ صدقہ اور زکات خدا کا حق ہے اور آپؐ

کاپاک ہاتھ یحٰ اللہ (۲۸) کا درجہ رکھتا ہے، اور آنحضرت کے برحق جانینوں (یعنی ائمہ مطہرین) میں یہ مرتبہ باقی و جاری ہے، تاکہ اس دستِ خدا سے ظاہر و باطن میں جو جو رحمتیں اور برکتیں حاصل ہوتی رہتی ہیں، ان میں کوئی کمی واقع نہ ہو، جیسے اخذِ زکات کے علاوہ عملِ بیعت (۲۸) ہے جو انتہائی ضروری ہے، کیونکہ بیعت کے معنی ہیں خرید و فروخت، یعنی یہ عملی تشبیہ و تمثیل اور اقرار ہے اس بات کا کہ خداوندِ عالم نے اپنے نمائندہ حاضر اور موجود کے توسط سے مومنین کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو خرید لیا ہے اور اس کے عوض میں ان کو بہشت ملے گی (۱۱۱) فرض یہ کہ ذاتِ سبحان ہر قسم کے اعضاء سے پاک و برتر ہے، لیکن اُس نے جس نورِ مجسم کو اپنا ہاتھ قرار دیا ہے، اس کو یہ زبردست قدرت بھی عطا کر دی ہے، کہ جس سے وہ ظاہر و باطن کا ہر ہر کام کر سکتا ہے۔

۲۔ مالِ مادی اور روحانی دو قسم کا ہوتا ہے، ظاہری اور جسمانی مال کو سب جانتے ہیں، باطنی اور روحانی مال سے حقیقی علم مراد ہے، چنانچہ زکات و صدقہ دونوں قسم کے مالوں سے لیا جاتا ہے، کیونکہ وہ دونوں چیزیں رزق اور دولت ہیں، اور دونوں کی پاکیزگی اور صفائی ضروری ہے، تاکہ وہ پاک ہوں، اور ان میں گونا گوں برکتیں پیدا ہو جائیں۔

۳۔ صدقہ ظاہر میں مادی زکات ہے، اور باطن میں صدقہ سے علم تاویل مراد ہے، کیونکہ صدقہ کا لفظ صدق سے نکلا ہے اور صدق کے معنی ہیں سچ بولنا، اور صاحبِ تاویل کو سچا ماننا، کہ وہ اپنی تاویل سے رسول اللہ کے روحانی معجزات



کی تصدیق کرتا ہے، جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مولا علی علیہ السلام سے فرمایا: **أنت الصديق الأكبر**۔ یعنی تم سچ بولنے والا اور تاویل کی روشنی میں میری تصدیق کرنے والا ہو۔ پس باطنی صدقہ یا زکات (یعنی تاویل) کے مختلف درجات ہیں۔

۴۔ **تطہیر** یعنی تطہیر ہم کا تعلق ظاہری مال، جسم اور جان سے ہے، کہ زکاتِ ظاہر کے دینے سے نہ صرف مادی مال پاک ہو جاتا ہے بلکہ اس سے جسم و جان کی بھی پاکیزگی ہو جاتی ہے، وہ اس طرح کہ حکم زکات پر عمل کرنے سے مال حلال ہو جاتا ہے، حلال مال کھانے سے جسم پاک ہو جاتا ہے، اور جسم کے پاک ہونے سے جان پاک ہو جاتی ہے۔

۵۔ **تزکیہ** یعنی تزکیہ ہم کا اشارہ مومنین کی عقلی پاکیزگی کی طرف ہے، کیونکہ قرآن کریم کی کئی آیات مبارکہ میں یہ ارشاد موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایمانداروں کو کتاب و حکمت (یعنی تنزیل و تاویل) سکھا کر پاک کیا کرتے تھے (۱۲۹، ۱۵۰-۱۵۱، ۱۴۴، ۱۴۲) چنانچہ ظاہر ہے کہ علم و حکمت کے زیر اثر جو چیز پاک و صاف ہو جاتی ہے، وہ صرف مومن کی عقل ہی ہے، اور قرآن حکیم میں جہاں جہاں جسم و جان کی پاکیزگی کا ذکر آیا ہے، اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان کو عقلی پاکیزگی کی طرف لایا جائے، کیونکہ منزلِ آخرین اسی عقل میں ہے، لہذا یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا سب سے بڑا احسان ہے کہ اُس مہربان نے ہر زمانے میں لوگوں کے درمیان وسیلہ تطہیر و تزکیہ کو موجود و حاضر رکھا ہے، تاکہ وہ اہل ایمان کے مال، جسم، جان اور

عقل کو پاک و پاکیزہ کرے، جیسے قرآن مجید (۱۵۰-۱۵۱) میں نُورِ نبوت کے بعد نُورِ امامت کے تقرر کا ذکر فرمایا گیا ہے :-

اور تاکہ تم پر جو میرا انعام ہے اس کی تکمیل کرو اور تاکہ تم راہِ حق پر چلو (مسلمانو! یہ احسان بھی ویسا ہی ہے) جیسے ہم نے تم میں تم ہی میں کا ایک رسول بھیجا جو تم کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائے اور تم کو پاک کرے اور تمہیں کتاب (قرآن) اور حکمت کی باتیں سکھائے اور تم کو وہ باتیں سکھائے جن کی تم کو خبر بھی نہ تھی (۱۵۰-۱۵۱) یہ تو ایک قرآنی حقیقت ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد کوئی پیغمبر نہیں (۳۳) اس کے معنی یہ ہوتے کہ کوئی جدید وحی نازل نہیں ہوگی یعنی قرآن مقدس اور دین اسلام ہی قائم رہے گا، باقی جتنی چیزیں علم و حکمت اور رشد و ہدایت کے عنوان سے ہیں، ان کا جانشین رسولؐ یعنی امام برحقؑ میں ہونا ضروری اور لازمی ہے، یہاں تک کہ خدائے علیم و حکیم ہر امام کے سامنے سے زمان و مکان کے تمام ظاہری اور باطنی حجابات کو اٹھاتا ہے، تاکہ نُورِ امامت نُورِ نبوت کو نزولِ وحی کے مقامات پر دیکھے اور جملہ احوال سے باخبر ہو کر آنحضرتؐ کی نبوت و رسالت پر شاہد (گواہ) ہو، اس حد تک رسالتی، حاضری، اور مکمل آگہی کے بغیر کوئی شخص کا نبوت کا حقیقی شاہد نہیں بن سکتا ہے۔

۴۔ صلّ کے لفظ میں رسول اکرمؐ سے فرمایا گیا ہے کہ آپؐ مومنین کو صلوٰۃ دیں، لیکن یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ صلوٰۃ کس معنی میں ہے؟ کیونکہ صلوٰۃ کے کئی معنی ہیں، چنانچہ قرآن کریم کی روشنی میں یہ حقیقت

روشن ہو جاتی ہے کہ یہ لفظ (یعنی صلوة) دُرُود کے معنی میں ہے، کیونکہ سورۃ بقرہ کی آیت ۱۵۷ سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ دُرُود، رحمت، اور ہدایت تمام اہل ایمان کے لئے مشترک ہے، جس طرح سورۃ احزاب (۳۳) میں اشداد فرمایا گیا ہے: خدا ایسا ہے کہ وہ اور اس کے فرشتے تم پر دُرُود بھیجتے ہیں، تاکہ خدا تعالیٰ تم کو تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آئے اور اللہ تعالیٰ مومنین پر بہت مہربان ہے (۳۳) اب اس مقام پر ہر دانشمند کو یہ سوچنا ہو گا کہ آیا یہ ممکن ہے کہ رب العزت اور اس کے ملائکہ کا یہ دُرُود رحمت عالم کے بغیر دینداروں پر تازل ہو جائے؟ حالانکہ ادھر خداوند عالم کا حکم ہو رہا ہے کہ: وَصَلِّ عَلَيْهِمْ (اور تم ان کو صلوة دو)؛ اس سے ظاہر ہے کہ یہ صلوة (دُرُود) جو خدائے پاک اور اس کے عظیم فرشتوں کی جانب سے ہے، جس کا مقصد نورِ علم ہے، حضورِ انورؐ کے توسط سے مومنین کو پہنچتی ہے، کیونکہ آپؐ ہی کی ذاتِ عالی صفات ہر عالمِ شخصی کے لئے رحمت ہے (۲۱-۱۰۷)

قانونِ حکمت کہتا ہے کہ جب مومنین محمد و آل محمد پر دُرُود پڑھتے ہیں، تو یہ ایک پاک کلمے کی حیثیت سے بلند ہو کر خداوندِ عالم کے حضور میں پہنچ جاتا ہے (۲۵-۱۰) پھر اللہ اس کو ایک نورانی ہئیت دے کر پیغمبرِ برحقؐ اور امامِ زمانہؑ کے توسط سے مومنین کی طرف بھیجتا ہے، کیونکہ ہر چیز ایک دائرے پر واقع ہے، لہذا وہ جہاں سے روانہ ہو جاتی ہے، آخر کار کسی نہ کسی صورت میں وہاں گھوم کر واپس آتی ہے، مگر

یہ ہے کہ بعض چیزیں بڑی سرعت سے اور بعض زمانہاتے دراز کے بعد لوٹ جاتی ہیں (۳۳/۲۱، ۳۴/۲۱)

جب پروردگار عالم تابعدار مومنین کے جملہ اقوال و اعمال کو نورِ نوریت کے رنگ سے رنگین بنا دیتا ہے (۱۳۸/۳۲)، تو پھر سرورِ انبیاء صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اُس صلوٰۃ کی کیا شان ہوگی، جو آپ ﷺ کو خدا ایمانداروں کو دیتے ہیں؟ جس میں خدا اور فرشتوں کی صلوٰۃ بھی شامل ہے؛ یقیناً وہ نور کی شعاعیں برسنے کی صورت میں ہے، چنانچہ وَصَلَّ عَلَیْہِمْ (اور ان پر درود بھیجو) کی تاویل یہ ہے کہ اے رسول! اُن پر نورِ علم و حکمت کی شعاعیں برسنا، کیونکہ اِس آسمانی درود کا مقصد یہی ہے کہ خدا تعالیٰ اہل ایمان کو بہالت کی تاریکی میں رکھنا نہیں چاہتا ہے، انکے باطن کو نورِ یقین سے منور کر دینا چاہتا ہے، جیسا کہ اِس کے پاک فرمان کا ذکر ہوا (۳۳/۳۳)

۷۔ تسکین زیرِ بحث آیت کریمہ کی آخری حکمت ہے، لہذا وہ عظیم شے ہے اور وہ نور ہے، یعنی کہ نہیں برسنے کے نتیجے میں نور کا سامنے آنا، جس سے کئی معنوں میں حقیقی مومنین کو تسکین و تسلی حاصل ہوگی، مثال کے طور پر:

الف: اِس بات کا یقین ہوگا کہ خدا و رسولؐ برحق ہیں، قرآن، اسلام، اور امام زمانؑ برحق ہیں، کیونکہ ان کے یہاں روشنی پر روشنی ہے۔

ب: روشنی کو دیکھ کر یوں یقین آتے گا کہ الحمد للہ مال، جسم، اور بھان کی تطہیر کا معاملہ درست چل رہا ہے، اور تزکیہ و عقل کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔

ج: ذکر و عبادت اور ہر نیک عمل خدا کے حضور میں قبول ہو رہا ہے۔  
 د: یقیناً یہی قرآن حکیم اور نورِ امامت کی پُر حکمت ہدایت و رہنمائی ہے، اور یہی صراطِ مستقیم پر مومن کی ترقی و پیشرفت ہے۔  
 ہ: اس حال میں دوسرے شیطانی اور خیالی باطل کی پریشانی نہ ہوگی۔

و: ایسے میں ابدی نجات کی امید کا وابستہ ہو جانا لازمی امر

ہے۔

قرآن حکیم میں لفظ طہارت کے معنی عام بھی ہیں اور خاص بھی، کیونکہ یہ لفظ ظاہری اور باطنی دونوں قسم کی چیزوں کے لئے استعمال ہوا ہے، مگر زکات کے معنی عام نہیں خاص ہیں، کیونکہ یہ باطنی چیزوں کے لئے مستعمل ہے، طہارت و تطہیر کے مختلف الفاظ قرآن پاک میں کل ۳۱ مقامات پر ہیں جبکہ زکات و تزکیہ سے متعلق تمام صیغے ۹ و ۵ جگہوں میں مذکور ہیں۔

کامل انسانوں کی تطہیر کی ایک خاص مثال اس آیت کریمہ میں موجود ہے:  
 اِنَّ قَالَ اللّٰهُ..... اَلْحٰی یَوْمَ الْقِیَامَةِ (۵۵) جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے عیسیٰؑ بیشک میں تم کو وفات دینے والا ہوں اور تم کو اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور جنھوں نے تمھارا انکار کیا ہے ان سے تم کو پاک کرنے والا ہوں اور تمھاری پیروی کرنے والوں کو قیامت تک ان پر بالادست رکھوں گا جنھوں نے تمھارا انکار کیا ہے۔ اس بانی تعلیم میں کئی تاویلی اشارے موجود ہیں، چنانچہ یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام

کی جس وقت کا ذکر فرمایا گیا ہے، وہ آپ کی رُوحانی موت تھی، جو تمام کامل انسانوں پر جسمانی زندگی ہی میں واقع ہو جاتی ہے، اور اسی کے ساتھ ذاتی قیامت برپا ہو جاتی ہے، جس کا بارگاہِ ذکر ہو چکا ہے، اُس دورانِ شخصِ کامل کی صورتِ روح بلکہ صورتِ روح کو اللہ تعالیٰ کی طرف اٹھالیا جاتا ہے رُوحِ کایہ معجزہ موتِ اتر جو حضرت عنذرائیل علیہ السلام دکھاتا ہے بڑا سیرت انگیز ہے، اسی کے ساتھ ساتھ انسانِ کامل کی تطہیر بھی ہو جاتی ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے عالمِ شخصی میں منکرین کے جتنے ذراتِ رُوح میں وہ ایک طرح سے ہلاک ہو جاتے ہیں۔

سورۃ بقرہ (۲) آیت ۱۴۶ اور سورۃ آل عمران (۳) آیت ۷۷ کا تاویلی مفہوم یہ ہے کہ قیامت کے دن بعض لوگ اپنی نافرمانیوں کی وجہ سے کلامِ خداوندی کی سماعت اور وِجہِ اللہ کی رُویت سے محروم ہو جائیں گے، جس کی وجہ سے ان کی کوئی پاکیزگی نہ ہوگی، اس کے برعکس کچھ دوسرے لوگوں کو کلامِ پاک اور دیدارِ اقدس کی سعادت حاصل ہوگی جن کی بدولت وہ بدرجہٴ محال پاک و پاکیزہ ہوں گے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ نہ صرف کلمہٴ یاریِ علم و حکمت کا سب سے بلند ترین سرچشمہ ہے، بلکہ رُویت میں بھی سب سے بڑا اثرائتی خزانہ پوشیدہ ہے، پس عقل کا انتہائی ترکیبہ اسی مقام پر ہو جاتا ہے۔

اس مادی دُنیا میں ظاہری صفاتی اور پاکیزگی کے کئی ذرائع ہیں اور پانی اس مقصد کے لئے خاص ہے، کہ اس میں چیزیں دھولیا کرتے

ہیں، اور پانی خود بھی فطری طور پر بہت سی چیزوں کو دھولیتا ہے، بالفاظ دیگر اس میں کئی صاف و ناصاف اشیاء حل ہو جاتی ہیں، مگر آخر کار آپ دیکھتے ہیں کہ سمندر اپنے وجود کی صفائی و پاکیزگی کے لئے نور (سورج) سے رجوع کرتا ہے، اور نور یعنی آفتاب جہاں تاب ہی ہے، کہ وہ نہ صرف آفاقی دُولاب (رہنٹ) کو چلاتا ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ پانی کو لطافت، جدت، اور پاکیزگی بھی بخشتا ہے، پس یہ نور علم و حکمت کی ایک روشن مثال ہے کہ وہی عقلی و علمی پاکیزگی کا سب سے آخری اور سب سے اعلیٰ وسیلہ ہے۔

تصیر الدین نصیر ہونزائی

۱۳۔ فروری ۱۹۸۵ء

## تطہیر و تزکیہ

(۲)

آپ جانتے ہیں کہ ”تطہیر و تزکیہ“ کے موضوع کی ان دونوں قسطوں میں ”طہارت و زکات“ کے باطنی پہلو پر روشنی ڈالنا مقصود ہے، اس موضوع کی بہت بڑی اہمیت اس لئے ہے کہ طہارت و زکات اسلام کے سات ارکان میں سے ہیں، چنانچہ قانون قرآن کے مطابق روحی اور عقلی صفات و پاکیزگی اتنی ضروری اور لازمی ہے کہ اس کے بغیر کوئی کامیابی نہیں، جیسا کہ خداوند عالم کا فرمان ہے :-

قد افلح من زكَّھا - وقد خاب من دسَّھا (۹-۱۰)

یقیناً وہ مُراد کو پہنچا جس نے اُس (جان) کو پاک کر لیا اور تا مراد ہوا جس نے اس کو دنا فرمائی میں، گاڑ دیا۔ یہ سورہ شمس (۹۱) کا ارشاد ہے، جس کا خاص موضوع نفس یعنی رُوح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس حکمت آگین سوئے کی سات ابتدائی آیات میں الگ الگ گیارہ عالی مرتبت چیزوں کی قسم کھاتی ہے، اور اسی حکیمانہ طریق پر اصل موضوع کی طرف مکمل توجہ دلانے کے بعد یہ ذکر فرمایا گیا ہے کہ رُوح کو کیا کیا صلاحیتیں دی گئی ہیں



پھر بڑی شدت کے ساتھ انسان کو احساس دلایا گیا ہے کہ وہ خود اپنی روح کی پاکیزگی کا ذمہ دار ہے، اور یہ ذمہ داری اس معنی میں ہے کہ وہ وسیلہٴ تطہیر و تزکیہ سے رجوع کرے۔

مذکورہ سورۃ مبارکہ میں پروردگار پاک نے سورج، چاند، وغیرہ کی تاویلی سمجھت میں جن بلند درجات کی قسم کھائی ہے، ان میں سے ایک رجب روح بھی ہے، جس سے حقیقی روح کی عظمت و بزرگی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے، کیونکہ ربِّ کریم حقیقت عام چیزوں کی قسم نہیں کھاتا، پس یہ خدائے علیم و حکیم کی جانب سے لوگوں کے لئے پُر زور اشارہ ہے، تاکہ وہ اپنی روح کی قدر و منزلت کو سمجھتے ہوئے اس کو پاک و پاکیزہ کر لیں۔

اگر رات کے وقت آسمان پر بادل چھاتے ہوئے نہیں ہیں، تو ایک دوسرے سے الگ الگ اور دُور واقع ہونے کے باوجود تمام ستاروں کی روشنی ایک ہو کر زمین کی طرف آتی ہے، اسی طرح ہر قرآنی موضوع سے متعلق آیات اگرچہ یکجا نہیں، بلکہ قرآن حکیم میں پھیلی ہوئی ہیں، لیکن اہل بصیرت کے نزدیک متعلقہ آیتوں کی حکمتیں مرکوز ہو جاتی ہیں، کیونکہ قرآن پاک دراصل سماوی نظام کے عین مطابق ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حکم سے سرچشمہء نور نہ صرف ذاتی طور پر پاک و پاکیزہ کہلاتا ہے، بلکہ دُوسروں کے لئے بھی یہی تطہیر و تزکیہ کا ذریعہ اور وسیلہ ہوا کرتا ہے، چنانچہ کسی مومن کو اس حقیقت میں کیا شک ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا اُنشی طور پر نور اور

مُقَدِّس قَسَم، اور اسی طرح آپ کا خاندانِ عالی مرتبت بھی، یعنی حضرت مولانا علیؑ، حضرت فاطمہ زہراؑ، حضرت حسن مجتبیٰؑ، حضرت حسین سید الشہداءؑ، اور سلسلہ نور کا ہر امامؑ۔

خدا تعالیٰ کے برگزیدہ بندے کس طرح پیدا کرتی پاک ہو کرتے ہیں؟ اس کے لئے بہت سے دلائل موجود ہیں، مگر یہاں صرف دو قرآنی شہادتوں سے کام لینا کافی ہوگا، چنانچہ اس حقیقت کی پہلی گواہی یہ ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے ربِّ کریم کی بارگاہ سے ایک پاک ذریت (اولاد) کے لئے دُعا کی، حالانکہ لفظ ”ذُرِّيَّةٌ“ انسان کا ایک ایسا نام ہے کہ اس کا اطلاق آدمی پر سلسلہ تخلیق کی ہر کڑی میں ہوتا ہے، پس غیر موصوف کی اس طلب کے یہ معنی ہوتے کہ انھوں نے ایک ایسا فرزند چاہا، جو نہ صرف پشتِ پدر اور شکمِ مادر میں پاک ہو، بلکہ قبل ازیں بھی معصوم و پاکیزہ رہ چکا ہو، وہ دعا یہ ہے: ”قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً“ (۳۸)، اس جگہ حضرت زکریا نے دُعا کی اور کہا کہ اے میرے پروردگار مجھے اپنے حضور سے ایک پاک ذریت (اولاد) عنایت کر دے۔ چنانچہ خداوند عالم نے حضرت زکریاؑ کو ایک معصوم و پاک فرزند عطا کر دیا، جس کا پیارا نام یحییٰؑ تھا۔

دوسری شہادت یہ ہے کہ روح القدس نے ایک کامل و مکمل انسان کی شکل اختیار کر کے حضرت مریمؑ سے کہا: ”قَالَ إِنَّمَا آتَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لِكَ عِلْمًا زَكِيًّا“ (۱۹)، اُس نے

کہا کہ میں تمہارے رب کا بھیجا ہوا (فرشتہ) ہوں تاکہ تم کو ایک پاکیزہ لڑکا دوں۔ اس قرآنی ارشاد سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ صرف پیدا تاش کے وقت ہی معصوم تھے، بلکہ اس سے پہلے بھی ہر طرح سے پاک و پاکیزہ تھے، کیونکہ آپ کو نورِ خدا کا درجہ حاصل تھا (۱۱۶-۱۱۸)، پس اس مثال سے یہ دعویٰ حق بجانب ہو گیا کہ پیغمبرِ اکرمؐ اور امامِ عالی مقامؑ پیدا تاشی طور پر معصوم و پاک ہوا کرتے ہیں، کیونکہ نورِ نبوت اور نورِ امامت ہمیشہ سے پاک و پاکیزہ ہوتا ہے۔

سوال: آیہ تطہیر سے ایسا تاثر ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بیت یعنی حضرت محمدؐ، حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ، حضرت حسنؑ، اور حضرت حسینؑ صلوات اللہ علیہم کو زمانہ نبوت کے کسی سال میں بدرجہہ کمال پاک و پاکیزہ کیا (۳۳) اس سے پہلے نہیں، پھر کوئی کس طرح قبول کرے گا کہ وہ حضرات فطری طور پر پاک تھے؟

جواب: اس سلسلے میں سب سے بنیادی اور عمدہ بات یہ ہے کہ ہم حضرت خاتم الانبیاءؐ سے قبل کے انبیائے قرآن کو آنحضرتؐ کی گونا گون صفات کے آئینے مابین، چُنا چُجہ جب ہم حضورِ انورؐ اور آپ کے اہل بیت کو آئینہ عیسیٰؑ میں دیکھتے ہیں تو شروع ہی سے معصوم و پاک نظر آتے ہیں، ہم ایسا اس لئے کرتے ہیں کہ بموجب قرآن (۳۳) اہل بیت پاکیزگی میں ایک ساتھ ہیں، اور رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عالمگیر صفات نہ صرف آپ

کے ظاہری تذکرے میں ہیں، بلکہ دوسرے پیغمبروں کی اعلیٰ مثالوں میں بھی ہیں، اب آیتے ہم اس پر حکمت قانون کے مطابق اہل بیتِ عظام کی تطہیر کو حضرت عیسیٰؑ کی تطہیر میں دیکھتے ہیں، سو آپ نے اس موضوع کی پہلی قسط میں حضرت عیسیٰؑ کی پاکیزگی سے متعلق آیت مبارکہ (۵۳) کی تاویلی حکمت پڑھی ہوگی کہ اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ آپ کے عالم شخصی میں اہل انکار کے جتنے ذراتِ رُوح داخل ہوتے تھے، وہ سب کے سب ہلاک کئے گئے، اُو یہ واقعہ اُس وقت رُو نما ہو جاتا ہے، جبکہ انسانِ کامل منزلِ عزرائیلی کے عظیم الشان عجائب و غرائب سے گزرنے لگتا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اور حضراتِ اہل بیتؑ کی تطہیر ان کی ذواتِ عالی صفات کی کسی کدورت کی وجہ سے نہیں، بلکہ منکرین کے ذراتِ ارواح کے سبب سے ضروری تھی، کیونکہ انبیاء و اولیاءِ خاندانہ کا درجہ رکھتے ہیں، لہذا اگر اس میں مشرکین داخل ہو گئے تو انھیں نکال دینا ہے، کیونکہ وہ اعتقادی طور پر نجس ہیں (۹۸)، اس قرآنی دلیل سے یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ اہل بیتِ کرامؑ خدا کے برگزیدہ بندے ہونے کی بنا پر پیدا تھی پاک و پاکیزہ تھے۔

جس نُورِ ازل (۹۷) کو خدائے پاک و برتر کی جانب سے یہ حکم ملا ہو کہ وہ اہل ایمان کی تطہیر و تزکیہ کرے (۱۰۳)، اس کو اس سے پہلے مطہّر اور مُزکّی (یعنی لوگوں کو ظاہر و باطن میں پاک و پاکیزہ کر دینے والا) بنایا گیا ہے، اور یہ فعل دراصل علم و حکمت کی صورت میں ہے، چنانچہ

اللہ تعالیٰ نے نورِ امامت کو نورِ نبوت کا جانشین مقرر فرمایا، تاکہ وہ لوگوں کو نور (یعنی حقیقی علم) کے پانی میں نہلا کر صاف و پاک کرتا ہے اور یہ سلسلہ کبھی منقطع نہ ہو جائے، اور ایسے بہت سے اعلیٰ معنوں میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ کا نور ہمیشہ ضوِ قشانی کرتا رہے گا (۳۲، ۹، ۶۱، ۵۷، ۶۸) اور اس کو کوئی نہیں ٹھیس سکتا۔

آپ یہ پُر حکمت اصول ضرور یاد رکھیں کہ عالم کی ضد جہالت

(جہالت = نادانی) ہے، لہذا قرآن حکیم میں براہِ راست بھی اور گونا گوں مثالوں میں بھی جس کثرت سے علم کا ذکر آیا ہے، اسی طرح اور اتنا زیادہ جہالت کا بھی ذکر ہوا ہے، چنانچہ اگر علم نور ہے تو اس کے مقابلے میں جہالت ظلمت کہلائے گی، خواہ یہ مقابلہ لفظی طور پر ہو یا تصویری کیفیت میں، اگر علم کا نام یقین رکھنا ہے تو جہل کو شکِ سردار دینا پڑے گا، اگر اس کو ہمیشہ کہنا ہے تو اس کو دوزخ کہنا ہوگا، اگر علم کو ہدایت کے اسم سے موسوم کیا گیا تو اُس وقت جہالت کو ضلالت (گمراہی) کا نام دینا ہوگا، اگر شفاء سے علم مراد ہے تو بیماری کی تاویل جہالت ہوگی، اگر سُننے، بولنے، اور دیکھنے کا اشارہ علم کی طرف ہے تو ضَمَمٌ، بَسَمٌ، عُمَمٌ (یعنی بہرے، گونگے، اور اندھے ہیں) میں جاہلوں کی مذمت ہوگی، اور اگر علم سے عقل و جان کی صفائی و پاکیزگی ہوتی ہے تو اس کے برعکس جہالت سے نجاست و غلاظت ہوگی۔

سورۃ رعد (۱۳) میں درختِ طوبی کا ذکر ہے اور سورۃ

ابراہیم (۱۲۴) میں شجرہ طیبہ کا، اور دونوں کے معنی ہیں پاک درخت، یہ نور امامت کی مثالوں میں سے ہے، کہ امام زمانہ دنیا و عقبیٰ میں وہ پاک و پاکیزہ علمی درخت ہے، جس کے ثمرہ طیبہ کھانے سے مومنین کی پاکیزگی ہو جاتی ہے، یعنی امام اقدس اطہر کی تعلیمات و ہدایات کی بدولت غیروں کی باتیں مومن کے دل و دماغ سے دھل جاتی ہیں، تاہم تطہیر و تزکیہ کا سلسلہ اتنا طویل ہے، جتنا کہ تعلیم و تربیت کا سلسلہ ہے، کیونکہ طفلِ محنت کی طرح بتدریج آگے سے آگے بڑھنے کے لئے لوحِ ضمیر کی تحریر کو دھو کر از سر نو لکھنے کا عمل ہر وقت جاری رہتا ہے۔

سورۃ فرقان (۲۵) میں اُس پانی کو "طہور" یعنی بہت پاک قرار دیا گیا ہے، جو آسمان سے برستا ہے، اس سے رسولِ خدا کا وہ علم مراد ہے جو آنحضرت کے بابِ دروازہ، یعنی امامِ برحق سے ظاہر ہوتا ہے، کیونکہ آسمانِ رسالت سے جو علم کی بارش برسی تھی، اس کے تمام تر ذخائر کو کوہِ امامت میں بن گئے ہیں، جس طرح دنیا کا پہاڑ مادّی قسم کی برف و بارش کو اپنے ظاہر و باطن میں نہ صرف جمع کر لیتا ہے، بلکہ اس کو اصلی حالت میں پاک و پاکیزہ محفوظ بھی رکھتا ہے، سو جو لوگ اس مبارک اور عالی شان پہاڑ سے متصل آباد ہیں، ان کو دینی علم کا یہ پانی جو بہت پاک ہے ہمیشہ مہیا ہوتا ہے، جس سے ان کی عقل و جان کی پاکیزگی ہوتی رہتی ہے، جیسے سورۃ دہر (۲۱) میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اہلِ جنت کو شرابِ طہور یعنی ایک بہت پاک پینے کی چیز پلائے

گا، پس یہ وہی حقیقی علم ہے، جس کا ذکر ہوا۔

تظہیر و تزکیہ کے بہت سے مقاصد ہیں، اور

ان میں بلند ترین مقصد یہ ہے کہ مومنین کو اسرارِ معرفت تک رسائی

ہو، جبکہ معرفت کے بھید قرآن حکیم کی تاویل میں پوشیدہ ہیں، اور قرآنی تاویل

امام زمانؑ کے مرتبہ باطن (نور) میں ہے، جس کا ایک نام "کتاب

مکنون" ہے، جس کو کوئی شخص دستِ عقل سے چھو نہیں

سکتا، مگر صرف ایسے لوگ جو عقلی اور علمی حیثیت میں

پاک کئے گئے ہیں (۲۷-۲۹)، پُنا پنچہ اسلام میں یعنی عبادات و معاملات

ہیں، وہ سب اسی آخری مقصد کے پیشِ نظر ہیں، کہ معرفتِ توحید کے

نتیجے میں مومنوں کو گنجِ مخفی حاصل ہو۔

سورۃ فاطر میں ارشاد ہے: پاکیزہ باتیں اسی کی طرف چڑھتی ہیں اور

نیک عمل ان کو اٹھاتا ہے (۱۰-۱۱)، اس پر حکمتِ آیت کا اشارہ یہ ہے کہ جب

امام برحقؑ کی طرف سے مومنین و مومنات کی عقل و جان اور اقوال و اعمال کی

کی تطہیر مکمل ہو، تو اُس وقت اُن کی رسائی عالمِ علوی سے ہوگی،

جس کے لازوال خزانوں کو دیکھ کر اُن کو بی مسرت و شادمانی حاصل ہوگی۔

سورۃ نحل کے ایک پر حکمت ارشاد (۱۳۲) کو دیکھتے، جس کے نصاب

عام دو پہلو ہیں، پُنا پنچہ یہاں اس کے نصاب پہلو کے مطابق بات کی جاتی

ہے، وہ یہ کہ کامل انسان پاک و پاکیزہ ہوا کرتے ہیں، لہذا ان کی روحانی

ترقی کسی رکاوٹ کے بغیر آگے بڑھتی ہے، اور اس سلسلے میں ان کی انفرادی

قیامت (جس میں ایک اجتماعی قیامت بھی پوشیدہ ہے) برپا ہو جاتی ہے، اس وقت فرشتے اکھران کی رُوح کو قبض کر لیتے ہیں، درحالی کہ وہ زندہ ہوتے ہیں، فرشتے ان سے گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہے، اب تم اپنی نیکی کاری کی بدولت بہشتِ رُوحانیت میں داخل ہو جاؤ۔

نصیر الدین فصیر ہونزائی

۲۰۔ فروری ۱۹۸۵



## خانۂ خدا - خانۂ جماعت

(یہ پہلی قسط)

اسلام اپنی روح میں کامل و مکمل دین ہے، اس میں رشد و ہدایت اور علم و حکمت کی فراوانی ہے، اس کا ہر قول و عمل اور ہر چیز ظاہر و باطناً عقلی اور روحانی خوبیوں سے مالا مال اور یقین و معرفت کے اشارات سے بھر پور ہے، چنانچہ آج ہم یہاں عنوان بالا (خانۂ خدا - خانۂ جماعت) سننے بحث کرتے ہیں، اور یہ معلوم کر لینا چاہتے ہیں کہ آیا ذات سبحانِ حقیقت کسی گھر کے لئے محتاج ہے یا اس کی حاجت و ضرورت دراصل اہل ایمان کو ہے؟ اگر اس کا جواب یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ جو کون و مکان کا خالق و مالک ہے، وہ مکان و لامکان سے بے نیاز و برتر ہے، سو اس حال میں یہ سوال ہو گا کہ اگر خانۂ خدا کا یہ تعین لوگوں کی دینی ضرورت کے پیش نظر ہے تو پھر بتائیے کہ اس سے ان کو کیا کیا فائدے حاصل ہوتے ہیں؟ اور اس میں کیا کیا اسرار پنہاں ہیں؟ اس کا مفصل جواب ذیل میں درج ہے:-

۱- جا و جہت یا مکان و زمان کے اعتبار سے خدا کا تصور تین

دربوں پر مبنی ہے، اول یہ گویا خداوند تعالیٰ ایک خاص گھر میں جلوہ نما ہے، جس طرح بیت اللہ کا تصور ہے (۲۲)، دوسرا یہ کہ وہ ہر جگہ موجود ہے (۱۱۵)، اور تیسرا یہ ہے کہ وہ مکان و لامکان سے بے نیاز و برتر ہے، کیونکہ وہ سبحان، قدوس، اور صمد ہے، اور یہ حقیقت مسلمہ اور ناقابل تردید ہے، چونکہ اسلامی تعلیمات و ہدایات تدریجی صورت میں ہیں، لہذا یہ امر ضروری قرار پایا کہ ہر فرد مسلم سب سے پہلے خانہ خدا کے عقیدہ تراخی کو اپنائے، اور اس سے وابستہ ہو جائے، تاکہ اس کو یہیں سے اللہ تبارک و تعالیٰ کی وحدانیت کی معرفت حاصل ہو، اور اگر کوئی شخص اس بنیادی تصور کی حکمت کو نہیں سمجھتا، اور اسے نظر انداز کرتا ہے، تو وہ دوسرے اور تیسرے تصور کے خزانوں کو براہ راست حاصل نہیں کوسکتا، کیونکہ خدائی قانون کے خلاف چلنا باعث نامرادی ہے۔

۲۔ اسلام میں جس طرح عرش عظیم کا تصور ہے، وہ بھی دینِ حق کی جملہ حکمتوں کا مرکز ہے، اس سے نہ صرف خدا کے گھر کی عظمت و بزرگی کا ثبوت مل جاتا ہے، بلکہ ساتھ ہی ساتھ اس بہت بڑی فضیلت کا یقین بھی ہو جاتا ہے کہ جو مومنین زمین پر خانہ خدا کی آبادی و ترقی کے کاموں میں لگے ہوتے ہیں، وہ عالم بالا کے ان پاکیزہ فرشتوں کی طرح ہیں، جو عرش الہی سے متعلق ہیں یا اس کے گرد اگر دطواف کرتے ہیں، اس بیان سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی کہ جس طرح خانہ خدا کی نزدیکی

اور شناخت سے انسانوں کو فائدہ ہے، اسی طرح عرشِ اعلیٰ کی قربت و معرفت سے فرشتوں کو فضیلت حاصل ہوتی ہے، مگر اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہر شی سے بے نیاز و برتر ہے۔

۳۔ خدائے واحد کی ذاتِ پاک و منزہ اُس وقت بھی تھی، جبکہ خانہ کعبہ نہ تھا، اور بیت اللہ کی تعمیر اُس وقت ہوئی، جبکہ حضرت آدم علیہ السلام کے سیارۃ زمین پر اترنے کا وقت آیا، چنانچہ خدایندہ عالم کے امر سے فرشتوں نے خانہ خدای کی تعمیر کی، تاکہ آدمؑ و اولادِ آدمؑ اس سے رجوع کر کے روحانی فائدے حاصل کریں، اس سے معلوم ہوا کہ دین کی اصل و اساس خانہ خدای ہے، او یہی خدای کا گھر خانہ دین اور خانہ جماعت بھی ہے، جس کی اردو عبارت "جماعت خانہ" ہے "خدای کا گھر" کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں انوار و اسرارِ خدای و ندی کا ظہور اور فیوض و بركات کا نزول ہوتا رہتا ہے، تاکہ مومنین ہمیشہ خدای کے اس گھر میں جا کر مستفیض ہوتے رہیں اور روز بروز علم و عمل میں ترقی کرتے جاتیں۔

۴۔ خانہ کعبہ جس میں عظیم تاویلی حکمتیں پوشیدہ ہیں اپنی جگہ بیکرد ضروری ہے تاکہ مجملہ مسلمانانِ عالم اس کی ظاہری و باطنی حکمتوں کو سمجھتے ہوئے باہمی اتفاق و یکجہتی کی دولت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں، اور زمانہ نبوت کے مسلمانوں کی طرح سب کے سب سداک وحدتِ ملی سے منسلک ہی رہیں، اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی ضروری تھا کہ ذیلی طور پر ہر مسلم قریب میں خدای کا ایک گھر بنایا جاتے، کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں

کہ دُور دراز ممالک کے مسلمان روزانہ عبادت کے لئے خانہ کعبہ میں پہنچ سکتے ہیں چنانچہ سرورِ انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد کے نام سے خدا تعالیٰ کا مقامی گھر بھی بنا دیا، یہ صرف ایک چار دیواری تھی، جس میں تین طرف دروازے تھے.... آنحضرت کے بعد جتنی نئی مسجدیں تعمیر ہوئیں، سب کا بنیادی ڈھانچہ یہی رہا، رفتہ رفتہ مسجد کی تعمیر مسلمانوں میں ایک فن بن گئی، اس طرح ایک خاص طرز تعمیر کا ارتقاء ہوا.....

(فیروز سنز - اردو انسائیکلو پیڈیا)

۵۔ قبلہ اسلام کے کئی نام ہیں، جیسے کعبہ، جس کے لفظی معنی ہیں چار گوشہ مکان (۹۵)، البیت (گھر ۱۲۵)، البیت العتیق (قدیم گھر ۲۹)، بیت اللہ (خدا کا گھر ۱۲۵)، بَيْتٍ وَضِعَ لِلنَّاسِ (وہ گھر جو لوگوں کے واسطے مقرر کیا گیا ۹۴)، البیت المحرام (حُرمت والا گھر ۲)، المسجد الحرام (حُرمت والی مسجد ۱۳۴) وغیرہ۔

خانہ خدا کے مذکورہ اسماء میں کسی ابہام کے بغیر یہ جواز موجود ہے کہ جس طرح مسلمانوں کی عبادت گاہ کا نام مسجد درست ہے، اسی طرح اس کا نام "جماعت خانہ" بھی درست ہے، یعنی جماعت کا مذہبی گھر، کیونکہ اللہ کا گھر لوگوں کا دینی گھر ہوا کرتا ہے، جبکہ بیت اللہ لوگوں کے لئے مقرر ہے (۹۴) جب ہم تاریخی تحقیق (ریسرچ) کی روشنی میں زمانہ نبوت کو دیکھتے ہیں، تو اس میں باعتبار شکل مسجد اور جماعت خانہ ایک ہی چار دیواری نظر آتی ہے، چنانچہ میرے نزدیک مسجد رسول

خدا کا مقامی گھر اور حال و مستقبل کا جماعت خانہ تھی، جس کو اللہ پاک کے مرکزی گھر کی نمائندگی حاصل تھی۔

۶۔ مسجد کے معنی ہیں جاتے مسجدہ و مسجدہ کرنے کی جگہ، عبادت خانہ، نیز اس کے معنی ہیں عبادت، اور اس کی تاویل ہے اسمِ اعظم، اساس، اوام زمان، کیونکہ رب العالمین کا حقیقی اسمِ اعظم اور عقل و جان والا گھر ہادی زمان ہوا کرتا ہے، جیسا کہ کتابِ دعایم الاسلام جلد اول (عربی) کتابِ حج کے سلسلے میں صفحہ ۲۹۲ پر ذکر ہے کہ فرشتوں نے خانہ، خدا کی تعمیر کی، اس کے یہ معنی ہیں کہ ملائکہ نے انسان کامل کے عالمِ شخصی میں بیت اللہ کی روحانی تعمیر کی، کیونکہ فرشتوں کا اصل کام روحانی قسم کا ہوتا ہے، اور اگر یہ مان بھی لیا جاتے کہ فرشتوں نے واقعی کعبہ ظاہر کو بنایا تھا، تو اس کی تاویل حکمت یہ ہوگی کہ مومنین نے جو جسمانی فرشتے ہیں عالمِ جسمانی میں ایک جماعت خانہ بنایا، اور جیسا عمل ویسا بہترین ثواب کے قانون کے مطابق ان کے ہاتھ سے روحانیت میں کعبہ جان کی تعمیر کروائی گئی۔

۷۔ حضرت ابراہیم نے بیت اللہ کی تعمیر نو اسی مقام پر کیا، جہاں یہ طوفانِ نوح سے پہلے تھا، اس جگہ کی نشاندہی ایک ایسی ہوانے کی جو حضرت ابراہیم کی تسکین کے لئے خداوند تعالیٰ نے بھیجی تھی جس کا نام سیکنہ تھا، اس ہوا کے دوسرے تھے، جو ایک دوسرے کے سچھے گھومتے تھے، جس کی تاویل ذکرِ خدا اور اس کی روحانیت ہے اس سے یہ

حقیقت نمایاں ہو جاتی ہے کہ اللہ کے خانہ بظاہر کے تاویل میں منظر میں خانہ نورانیت کا تذکرہ موجود ہے، کیونکہ ہر ظاہر کا ایک باطن ہوا کرتا ہے، جیسا کہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَاسْبِغْ عَلَیْكُمْ نِعْمَةً ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً (۳۱/۳۰)**

سکینہ (۲۸/۲۶)

اور اُس نے تم پر اپنی نعمتیں ظاہری اور باطنی پوری کر رکھی ہیں۔

۸۔ اللہ تعالیٰ پاک فرمان ہے: **وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً**

**لِلنَّاسِ وَأَمْنًا وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّی ۖ ر ۱۷۵**، اور جس وقت ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے لئے جگہ تے ثواب اور مقام امن مقرر کر رکھا اور مقام ابراہیم کو جگہ تے نماز بنا لیا کرو۔

اس آیت کریمہ کی پہلی تاویل: جس طرح خدا کے حکم سے خانہ کعبہ ظاہر میں ثواب اور امن کی جگہ ہے، اسی طرح امام زمان صلوات اللہ علیہ باطن میں بیت اللہ کی حیثیت سے ہر قسم کے ثواب کا وسیلہ اور ہر طرح کے امن کا ذریعہ ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ امام برحق، قبلہ باطن ہیں، جس کی طرف قلبی توجہ ہر نیک کام میں لازمی ہے، اور طریق ثواب یہی ہے، آپ دیکھتے ہیں کہ ثواب کا ذکر پہلے ہے اور امن کا

ذکر بعد میں، اس کی حکمت یہ ہے کہ پہلے مومنین امام اقدس و اطہر کی اطاعت و فرمانبرداری سے ثواب و نیکی کے مراحل طے کر لیتے ہیں، پھر نتیجے کے طور پر امام عالمیت<sup>۳</sup> کی روحانیت کو نورانیت میں داخل ہو جاتے ہیں، اور یہی اللہ تبارک و تعالیٰ کا خانہ باطن ہے، جس میں امن ہی امن ہے، یعنی کوئی خوف و خطر نہیں۔

جس طرح ظاہر میں مقام ابراہیم خانہ کعبہ کی ایک ایسی جگہ ہے، جہاں ایک پتھر تھا، اسی طرح خانہ باطن یعنی امام مبین کی نورانیت میں ایک عقلی گوہر ہے، اُس تک رسائی حاصل کر کے نماز کی حکمتوں کو حاصل کر لینے کے لئے فرمایا گیا ہے۔

دوسری تاویل: جس طرح خانہ کعبہ اللہ کا مرکزی گھر ہے، اسی طرح جماعت خانہ خدا کا مقامی گھر ہے، یا اُنوں کہا جاتے کہ جیسے بیت اللہ شریف مقام شریعت پر ہے، ویسے مقدس جماعت خانہ مقام حقیقت پر ہے، لہذا مذکورہ آیت کریمہ میں جو فضائل بیان ہوئے ہیں، وہ خدا کے اس گھر کے بارے میں بھی ہیں، جو جماعت خانہ کے نام سے مشہور ہے، چُنتا پنجہ عقیدۃ اسماعیلیت اور قرآنی حکمت کے مطابق جماعت خانہ جاتے ثواب اور مقام امن ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ دین کے کل ادا و نواہی کا جملہ ثواب جماعت خانہ میں مرکوز ہے، اور روحانی امن و سکون بھی اسی میں ہے، کیونکہ جماعت کے اس خانہ دین کو دُہری فضیلتیں حاصل ہیں کہ یہ اگر ایک جانب سے خانہ کعبہ کا نمائندہ ہے، تو دوسری جانب

سے امام برحقؑ کی مثال ہے، جبکہ امامؑ نے بمنشائے الہی اپنی شخصیت اور ظاہری و باطنی قربت کی جگہ جماعت خانہ دیا ہے، پس مرحلہٴ اوّل میں جماعت خانہ کے لئے یہی مقام ابراہیم ہے۔

۹۔ سورۃ آل عمران (۹۶) میں ربِّ عزّت کا فرمان ہے: اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وَّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبْرَكًا وَهُدًىٰ لِلْعٰلَمِيْنَ (۹۶) یقیناً وہ مکان جو سب سے پہلے لوگوں کے واسطے مقرر کیا گیا وہ مکان ہے جو کہ مکہ میں ہے جس کی حالت یہ ہے کہ وہ برکت والا ہے اور جہان بھر کے لوگوں کے لئے رہنما ہے۔ اس آیت مبارکہ میں کئی حکیمانہ اشارات ہیں، منجملہ ایک اشارہ یہ ہے کہ ”اول“ اعداد تہی (ORDINALS) کی بنیاد ہے، اور اس کا تقاضا ہمیشہ یہ ہوا کرتا ہے کہ اول (پہلا) کے بعد دُورا، تیسرا، چوتھا، پانچواں وغیرہ بھی ہو، اس کا مفہوم یہ ہوا کہ اگرچہ لوگوں کا اولین اور مرکزی گھر مکہ میں ہے، تاہم زمانہ نبوت اور دورِ امامت میں ذیلی اور مقامی طور پر بہت سے گھر (جماعت خانے) ہوں گے۔

دوسرا اشارہ یہ ہے کہ جس طرح لوگوں کے واسطے اولین دینی گھر مکہ میں مقرر ہوا، اسی طرح امامِ اوّل (مولا علیؑ) بھی مکہ میں مقرر ہوئے، جو لوگوں کے لئے روحانیت و نورانیت کا گھر ہیں، جس میں اُن لوگوں کے لئے برکات و ہدایات ہیں، جو عالمِ شخصی بن جاتے ہیں۔

تیسرا اشارہ یہ ہے کہ ”بکّة“ کا ایک اشاراتی قرأت گریزائی کے معنی میں بھی ہے، سو اس کا تاویلی مفہوم یہ ہے کہ لوگوں کے لئے اولین



رُوحانیت کا گھر عشقِ مولا کے تابناک آنسوؤں سے بنایا جاتا ہے،  
جو اہل دل کے لئے برکتوں اور ہدایتوں سے بھر پور ہے۔

چوتھا اشارہ یہ ہے کہ خانہ کعبہ، امامؑ، اور جماعتِ خانہ اگر ایک  
طرف سے خدا کے گھر ہیں تو دوسری طرف سے لوگوں کے گھر ہیں، کیونکہ  
ان پاک گھروں میں جو برکتیں اور ہدایتیں ہیں، وہ لوگوں کے لئے ہیں، اور  
ان کا خدا تعالیٰ سے منسوب ہو جانا خصوصی ملکیت کی وجہ سے ہے۔

۱۰۔ سورۃ نور میں فرمایا گیا ہے: فِي بَيوتِ اَذِنَ اللّٰهُ اِنْ تُوْفِعَ

وَيُذَكَّرُ فِيهَا اَسْمُهُ، يُسَبِّحُ لَهُ، فِيهَا بِالْغَدُوِّ  
وَالْاَصَالِ (۲۳۶) (وہ نور، ایسے گھروں میں روشن ہے جن کی نسبت

خدا نے حکم دیا ہے کہ ان کی تعظیم کی جاتے اور ان میں اس کا نام لیا جائے  
جن میں صبح و شام وہ لوگ اس کی تسبیح کیا کرتے ہیں۔ ان گھروں سے حضرات  
آئمہؑ ظاہری صلوات اللہ علیہم مراد ہیں، نیز یہ گھر جماعتِ خانہ ہیں جن میں  
نورِ خداوندی کا چراغ روشن ہوتا ہے، جس کا مشاہدہ اور عرفان یقینی ہے۔

۱۱۔ خانہ کعبہ ظاہری علامت، مثال اور نمونہ ہے ان آیاتِ کریمہ  
کا، جن کی تاویلی حکمت کا تعلق خدا تعالیٰ کے زندہ گھر یعنی امام علیہ السلام  
سے ہے، اور امام عالی مقامؑ کی معرفت جو نہایت ہی ضروری ہے وہ  
کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی، مگر اطاعت سے، اور اطاعت و فرمانبرداری  
کا مرکز جماعتِ خانہ ہے، کیونکہ یہ جہاں ثواب اور مقامِ امن ہے۔

جس طرح ہر چیز کی رُوح ہو اُگرتی ہے، اسی طرح جماعتِ خانہ

کی ایک عظیم رُوح ہے، یہ امامِ زمانہؑ کی رُوح یعنی نور ہے، جس میں جماعتی رُوح زندہ ہو جاتی ہے، پس اگر آپ باور کرتے ہیں کہ جماعتِ خانہ میں امامِ برحقؑ کا نور موجود ہے، تو یہ بھی جان لیں کہ یہ نور اللہ تعالیٰ کا زندہ گھر ہے، جیسا کہ قرآن پاک کا ارشاد ہے :-

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ  
وَالَّذِينَ مَعَهُ (۲۴) تمہارے واسطے تو ابراہیمؑ اور ان کے  
ساتھیوں (کے قول و فعل) کا اچھا نمونہ موجود ہے۔ اس ربّانی تعلیم سے  
یقینی طور پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ویسے تو ظاہر میں حضرت ابراہیمؑ  
علیہ السلام کے ساتھ بہت سے لوگ تھے، مگر جو حضرات باطن میں آپ  
کے ساتھ تھے، وہ آپ کی پیروی میں درجہ انتہا پر پہنچ گئے تھے، اگر  
ایسا نہ ہوتا تو ان کا اُسوۂ حسنہ حضرت ابراہیمؑ کے اُسوۂ حسنہ سے  
نہیں ملتا، اب پوچھنا یہ ہے کہ ایسے حضرات کون تھے یا کون ہیں؟ آل  
ابراہیمؑ ہیں، یعنی انبیاء و ائمہ علیہم السلام، جن کا ظہور جناب خلیل اللہؑ  
کے نزدیک بہت ہی ضروری تھا (۱۲/۱۱۲) اور خدائے مہربان نے آلِ ابراہیمؑ  
کو سب کچھ دے رکھا تھا (۵/۲۴) چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم  
نے حکمِ خدا حضرت ابراہیمؑ کی پیروی کرتے ہوئے نہ صرف خانہ کعبہ کو قبلہ  
بنا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مقامی طور پر بھی خدا کا ایک گھر (مسجد) بنایا،  
اور پاک اماموں نے بھی اپنے وقت میں مسجد یا جامعہ خانہ کے نام سے  
اللہ کے ایسے گھروں کی تعمیر کی۔

۱۲۔ سورۃ قصص (۲۸) میں فرمایا گیا ہے: کیا ہم نے ان کو امن امان والے حرم میں جگہ نہیں دی جہاں ہر قسم کے پھل کھینچے چلے آتے ہیں جو ہمارے پاس سے کھانے کو ملتے ہیں، لیکن ان میں اکثر لوگ نہیں جانتے (۲۸) اگر آپ غور کریں تو صاف طور پر معلوم ہو جائے گا کہ ثمراتُ کُلِّ شَیْءٍ یعنی تمام چیزوں کے ظاہری میوے کہیں بھی خود بخود پھنچ کھنچ کر نہیں آسکتے، مگر یہ حقیقت ہے کہ پیغمبر اور امام صلوات اللہ علیہما جس جگہ کو عبادت کے لئے مقرر فرمائیں، وہاں کُلِّ اشیاء کے روحانی میوے پھنچ کھنچ کر خود بخود آتے رہتے ہیں، اور یہی روحانی معجزات، جماعتخانہ سے متعلق ہیں۔

جب قرآن حکیم نے کہا کہ ثمراتُ کُلِّ شَیْءٍ (جملہ اشیاء کے میوے)، تو اس خُداوندی کَلِمَۃ کے مطابق جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان سب کے سب درخت قرار پاتے، تاکہ ان میں سے ہر ایک کا پھل خانہ، خُدا کی طرف آئے، مگر یہ صرف اور صرف روحانی صُوَرَت میں ممکن ہے، چنانچہ جماعت خانہ وہ مقام ہے، جہاں امام زمانہ کی عظیم المرتبت روح (یعنی نور) کام کرتی ہے، جس کی طرف دُنیا بھر کی چیزوں کی روحیں پھنچ کھنچ کر آتی ہیں، جیسا کہ امام حسین میں اشیائے کائنات جمع ہوتی ہیں (۳۶/۱۲) پس حقیقی مومنین کے لئے جماعتخانہ سے متعلق یہ روشن دلائل کافی ہیں۔

فصیر الدین فصیر ہونزائی

## خانۂ خدا — خانۂ جماعت

(دوسری قسط)

اس حقیقت میں کوئی شک نہیں کہ خانۂ خدا خانۂ جماعت ہے، اور نہ ہی اس بات میں کوئی شبہ ہے کہ جس طرح دین کا مرکزی گھر خانۂ کعبہ ہے اسی طرح مقامی گھر جماعت خانہ ہے، اور یہ نظام اللہ تعالیٰ کی سنت اور قانونِ فطرت کے عین مطابق ہے، کہ ہمیشہ رحمتوں اور برکتوں کا مقام ظاہر اور باطناً بندوں سے قریب تر کر دیا جاتا ہے، جیسے حضرت آدم علیہ السلام کے اس دنیا میں آنے کے ساتھ ساتھ آپٹ اور آپٹ کی اولاد کی خاطر یہاں خانۂ خدا کی تعمیر کی گئی، جو اس زمین پر عرشِ عظیم کا درجہ رکھتا ہے، کیونکہ خدا کے عرشِ (تخت) کا جو مفہوم ہے، وہی مفہوم خدا کے گھر کا بھی ہے، اور جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں اللہ پاک کا ایک دوسرا گھر بنایا، جس کو ہم پہلی مسجد بھی کہہ سکتے ہیں اور اولین جماعت خانہ بھی، کیونکہ فی الاصل ان دونوں کی شکل اور حقیقت ایک ہی ہے، بہر حال وہ خدا کے قدیم گھر کا قائم مقام تھا، اس کے

یہ معنی ہوتے کہ خانہ کعبہ کو عرشِ عظیم کی نمائندگی حاصل ہے، اور جماعتِ خانہ کعبہ شریف کی نمائندگی۔

۲۔ آپ اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ اسلام میں تقویٰ کی بہت اہمیت ہے، کیونکہ تقویٰ جملہ عبادات کی جان ہے، اور اس مقصد کے حصول کے لئے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے، مگر شعراءِ بر اللہ یعنی خدا کی نشانیوں کی شانِ رحمت دیکھتے کہ ان کی حرمت و تعظیم سے قلبی تقویٰ کا عمل بن جاتا ہے (۳۲/۲۲)، اہم زمانِ صلوات اللہ علیہ و سلامہ، جو قرآنِ ناطق میں ان کی پاک و پاکیزہ شخصیت اور جماعتِ خانہ شعراءِ بر اللہ میں سے ہیں، لہذا ان کی تعظیم کرنا قلبی تقویٰ کا نتیجہ بھی ہے اور درجہ بھی، کیونکہ ان میں سے ایک خدا کا باطنی گھر ہے اور دوسرا ظاہری گھر۔

۳۔ سورج کے ایک ارشاد (۲۴/۲۲) کا تاویلی مفہوم یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو بیعت اللہ قرار دیا تھا، تاکہ اس مرتبہ کی روحانیت و نورانیت میں توحید کی معرفت حاصل ہو، اور خدا کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کیا جاتے، رب العزت نے آپ کو یہ بھی حکم دیا کہ آپ اللہ کے اس زندہ گھر کی نظریاتی، روحانی اور عقلی پاکیزگی کریں تاکہ اس میں تین قسم کے فرشتے آجائیں، اور وہ ہیں طواف کرنے والے، قیام یا اعتکاف کرنے والے، اور رکوع و سجود کرنے والے۔

۴۔ پیغمبر اور امام کی پاک شخصیت میں روحانی مسجد اور نورانی جماعتِ خانہ ہونے کا خدائی قانون ہمیشہ سے جاری ہے، جیسے حضرت

نوح علیہ السلام نے اس خانہ نورانیت کو "بیتتی (۶۸)" کہا، اور مومنین میں سے جو افراد اس میں داخل ہو چکے تھے، وہ "اہل بیت" کہلاتے تھے وہ قرآنی ارشاد یہ ہے :-

رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِي  
مُؤْمِنًا وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ (۶۸) اے میرے  
رب مجھ کو اور میرے ماں باپ کو اور جو کمال ایمان سے میرے (روحانی)  
گھر میں داخل ہو گئے ہیں ان کو اور تمام مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں  
کو بخش دے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ حضرت نوح کی اس پُرِ حُكْمَتِ دُعَا میں اہل  
ایمان دو درجوں میں ہیں، یعنی بعض مومنین کمال ایمان کی بدولت آپ کے  
خانہ نورانیت (یعنی خانہ مُخْتَلَا) میں داخل ہو چکے ہیں، اور بہت سے مومنین  
مومنات ہنوز اس درجے میں داخل نہیں ہو سکے ہیں۔

۵۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے وقت میں خدا تعالیٰ کا  
زندہ گھر (۶۶) اور نورانیت سے بھر پور معجزاتی جماعت خانہ تھے، جیسا کہ  
سورۃ احزاب (۳۳) میں فرمایا گیا ہے: اِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ  
عَنكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا (۳۳)  
اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ اے (نورانیت کے) گھر والو تم سے آلودگی کو دور  
رکھے اور تم کو (ہر طرح سے ظاہر اور باطناً) پاک و صاف رکھے۔ یہ مقدس  
گھر نورِ نبوت و امامت تھا، اور اہل بیت (گھر والے) نچتین پاک تھے،  
یعنی حضرت مُحَمَّدٌ مُصْطَفَى، حضرت عَلِيٌّ مُرْتَضَى، حضرت فَاطِمَةُ زَهْرَا،

حضرت حسن مجتبیٰ اور حضرت حسین سید شہداء صلوات اللہ علیہم، یہی خانہ نورانیت اللہ تعالیٰ کا بولنے والا گھر اور عقلی و روحانی جماعت خانہ ہے اور یہی وہ حکمت کا گھر ہے، جس کے بارے میں آنحضرت نے ارشاد فرمایا کہ: "میں حکمت کا گھر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے" نیز یہ وہی مبارک و مقدس گھر ہے، جس میں بموجب آیہ قرآن (۲۴/۳۵) نور خداوندی کا چراغ روشن ہے۔

۴۔ یہاں متعلقہ حقیقت کو دل نشین انداز میں پیش کرنے کی غرض سے یوں سوال کیا جاتا ہے کہ صراطِ مستقیم در راہِ راست کس کی ہے؟ آیا یہ خدا کی ہے یا انبیاء کی؟ کیا یہ راہِ آنحضرت کی ہے یا امامؑ کی؟ کیا یہ مومنین کے لئے نہیں ہے؟ اس کا جواب اس طرح سے ہے کہ صراطِ مستقیم سب سے پہلے خدائے پاک و برتر کی ہے، کیونکہ راہِ راست کی منزل مقصود وہی ہے، یعنی سب کو اسی کے خانہ نور میں جانا ہے (۲۴/۵۳، ۱۵۶) نیز صراطِ مستقیم مجملہ انبیاء علیہم السلام کی ہے، کیونکہ وہ حضرات اس پر لوگوں کے رہنما تھے (۱۱/۱، ۴۷/۱) یہ راہِ راست پیغمبرِ آخر زمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہے، اس لئے کہ حضورؐ سرورِ انبیاء و سردارِ رسل ہیں (۱۰۸/۱) نیز یہ رستہ امام عالی مقام علیہ السلام کا ہے، کہ آپ ہادی برحق ہیں (۱۱/۱) اور یہ بھی حقیقت ہے کہ صراطِ مستقیم مومنین کی ہدایت کے لئے بنائی گئی ہے (۱۱/۱) بالکل اسی طرح وہ اتہائی پاک و پاکیزہ گھر جو رب العزت کا ہے، وہ مذکورہ بالا تمام درجات

کا ہے، اگرچہ ذاتِ خدائے بے مثل مکان اور لامکان سے بے نیاز و برتر ہے، لیکن اس کی وحدانیت کی معرفت خاتمہ نورا نیت سے باہر ممکن نہیں (۳۵، ۳۶) یہ گھر جو رحمتوں اور برکتوں سے مملو اور نورِ معرفت سے منور ہے وہ انبیاء و ائمہ علیہم السلام کا نور ہے (۳۶) اور یہی نور سے معمور گھر مومنین و مومنات کا بھی ہے، جبکہ وہ مکمل پیروی کرتے ہیں (۶۸، ۵۷، ۱۳)

۷۔ قانونِ فطرت (پیدائش) یہ ہے کہ ہر چیز ابتداءً ایک محدود سانچے میں بنتی ہے، اس کے بغیر کسی چیز کا وجود میں آنا غیر ممکن ہے، درختوں کا پھل چھلکے کے بغیر اور مغز گھٹلی کے سوا نہیں بن سکتا، اور جس طرح انسان کی ہستی و شکل اپنی ماں کی بچہ دانی سے باہر نہیں بن سکتی ہے، اور دوسری طرف سے آپ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بعض اشیاء موجود تو ہیں، مگر ان کی کوئی مخصوص شکل و صورت نہیں، کیونکہ وہ سانچے کے بغیر بکھری ہوتی ہیں، جیسے عناصر اربعہ، یعنی مٹی، پانی، ہوا، اور آگ، چنانچہ بحکمِ خدا رسول اللہؐ اور صاحبِ امر نے اللہ تبارک و تعالیٰ کا ایک مقامی گھر بنا دیا، تاکہ اسی سانچے میں ڈھل کر ہر ریدہ حقیقت مومن کہلاتے اور اس کی ایک خاص ایمانی اور روحانی صورت بن جاتے۔

۸۔ جہاں رحمتِ گل کے قانون کی رو سے یہ ممکن ہے کہ عرضِ عظیم کا ایک نمونہ بصورتِ خاتمہ کعبہ زمین پر اتارا جاتے، پھر زمانہ طوفان میں آسمان چہارم پر اٹھایا جاتے، پھر زمانہ ابراہیمؑ میں زمین پلاس کی تعمیر نو ہو سکتی ہو، اور پھر عہد نبوت میں جہاں مقامی طور پر بھی خدا کا



ایک گھر بنایا جاسکتا ہو، تو وہاں یہ بھی ممکن ہے کہ جماعت خانہ خدائے مہربان کے خانہ ظاہر یعنی کعبہ شریف اور خانہ باطن (دامم) کی حقیقی نمائندگی کرے اور یہ بات حق و حقیقت ہے، اور اس میں ذرہ بھر شک نہیں۔

۹۔ جماعت خانے تین ہیں پہلا عالمی جماعت خانہ، جو امام زمان صلوات اللہ

علیہ کا مبارک وجود ہے، دوسرا مقامی جماعت خانہ، جو شہر یا قصبہ یا گاؤں یا محلے کا جماعت خانہ ہے، اور تیسرا انفرادی جماعت خانہ، جو بندۂ مومن کا دل ہے، مگر ان تینوں کی مربوط حکمت مقامی جماعت خانے میں ہے کہ وہیں پر رفتہ رفتہ روحانی ترقی ہوتی ہے، اور قلبی جماعت خانے کا دروازہ کھل جاتا ہے، پھر وہ نورِ ایمان سے متور ہو جاتا ہے، اور اسی میں امام اقدس و اطہر کا پاک دیدار ہوتا ہے، جو نورانیت کا حقیقی جماعت خانہ ہے۔

۱۰۔ سورۃ یونس (۱۰) میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

وَ اَوْحَيْنَا اِلَى مُوسَى وَاٰخِيهِ اَنْ تَبْنُوا لِقَوْمِكُمْ  
بِمِصْرَ بِيُوتًا وَاَجْعَلُوا بِسُورَتِكُمْ قِبْلَةً وَاَقِيمُوا  
الصَّلٰوةَ وَاَبشِرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۰) اور ہم نے موسیٰ اور  
ان کے بھائی (ہارون) کے پاس وحی بھیجی کہ مصر میں اپنی قوم کے لئے  
گھر بناؤ اور اپنے اپنے گھروں ہی کو مسجدیں قرار دے کر پابندی سے  
نماز پڑھو اور مؤمنین کو خوشخبری دے دو۔ ہر ایسے شہر کو مصر کہتے ہیں جس  
کے گرد و گرد فسیل (شہر پناہ) ہو اس سے شہرِ روحانیت مراد ہے، کیونکہ

اس کے گرد اگر وہ صرف فیصل ہے، بلکہ اس کا ایک دروازہ بھی ہے، چنانچہ اس آیتِ حکمت آگین میں انفرادی جماعتوں کی روحانی ترقی کا ذکر فرمایا گیا ہے، یعنی اللہ پاک نے پیغمبر اور امام علیہما السلام کو حکم دیا کہ وہ اپنی قوم کے حدودِ دین کے لئے شہرِ روحانیت میں گھر بنائیں، اور ان گھروں کو خانہِ رُخدا کا درجہ دے کر دعوتِ حق کا کام کریں، اور ایسے عروج و ارتقاء سے مومنین کو عملاً خوشخبری دیدیں۔

۱۱۔ سورۃ توبہ (۹/۱۸) میں ارشاد فرمایا گیا ہے: خُدا کی مسجدوں کو بس صرف وہی شخص (جاکر) آباد کر سکتا ہے جو خُدا اور آخرت کے دن پر ایمان لائے اور نماز پڑھا کرے اور زکوٰۃ دیتا رہے اور خُدا کے سوا (اور) کسی سے نہ ڈرے تو عنقریب یہی لوگ ہدایت یافتہ لوگوں سے ہو جائیں گے (۹/۱۸)، اگر کہا جائے کہ یہاں ”مَسَاجِدَ اللّٰهِ“ سے دُنیا بھر کے جماعت خانے یا مسجدیں مُراد ہیں، تو پھر ایک ہی شخص اُن سب کی آبادی میں کس طرح حصّہ لے سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ بات ناممکن ہے، چنانچہ یہ ارشادِ تاویلی حکمت کا متقاضی ہے، اور وہ حکمت یہ ہے کہ خُدا کی مسجدیں یعنی جماعت خانے تین درجوں میں ہیں، جیسا کہ ۹/۱۱ میں بتایا گیا ہے، عالمی جماعتخانہ (یعنی امامِ وقت)، مقامی جماعت خانہ، اوّ قلمی جماعت خانہ، اور ان تینوں کو ایک ساتھ صرف وہی شخص اپنی حاضری سے آباد کر سکتا ہے، جو خُدا اور یومِ آخر (امام) پر ایمان لائے اور نماز قائم کرے، یعنی کارِ دعوت کو انجام دے، اور ظاہری و باطنی کام

جب بندۂ مومن عقیدت و محبت سے متعلقہ جماعت خانے میں جا کر اللہ تعالیٰ کی بندگی کرتا ہے، تو اس پر حکمت عمل سے نہ صرف جماعت خانہ آباد ہو جاتا ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انفرادی اور عالمی جماعت خانے بھی معمور ہو جاتا ہے، کیونکہ خدا تعالیٰ کے یہ تینوں گھر مربوط اور یکجا ہیں، جبکہ مومن جماعت خانے سے وابستہ ہے، اور جبکہ امام زمان صلوات اللہ علیہ جماعت خانے کی رُوح ہیں، اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جو مومن جماعت خانے پر یقین کامل رکھتا ہے اس کی رُوح کے ذرات میں سے ایک خاص ذرہ ہمیشہ امام برحقؑ کی مبارک و مقدس شخصیت کی خدمت میں رہتا ہے، آپ حقیقتِ رُوح کے بارے میں تحقیق کر سکتے ہیں، اور ذراتِ رُوح سے متعلق مضامین کا مطالعہ بھی کر سکتے ہیں، تاکہ رُوح کے بسیط و سمہ جا ہونے کا حال معلوم ہو سکے۔

۱۲۔ فرمایا گیا ہے کہ: "مومن کا قلب (دل)، اللہ تعالیٰ کا عرش ہے" لیکن

یہاں پوچھنے اور جاننے کی ضرورت ہے کہ اس قول کی اصل حقیقت کیا ہے؟ کیونکہ لفظ "مؤمن" کا اطلاق تو بہت سے لوگوں پر ہوتا ہے، مگر عرش کا تصور بہت بلند ہے، لہذا آپ اس حکمت کو بخوبی دلنشین کر لیں، کہ مومن کا قلب امام زمان صلوات اللہ علیہ میں، اور اسی مقدس ہستی میں خدا کا نور جلوہ گر ہے، جیسے قرآن حکیم کا ارشاد ہے: **وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ** (۲۴) اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ

اگر بن جایا کرتا ہے آدمی اور اس کے قلب کے درمیان۔ یعنی حقیقی علم کی روشنی میں تم، اس قانونِ امتحان کو جان لو کہ آدمی اس کے دل (یعنی اہم زمانہ) کے درمیان خدا کیوں سائل ہو جاتا ہے؟ یقیناً اس میں حکیمانہ اشارہ اور کامیابی کا راز بس یہی ہے کہ ہر شخص اپنے حقیقی دل کے ساتھ اللہ سے رجوع کرے، وہ لوٹ کر اُس طرف سے آگے بڑھے، جس طرف اس کا دل ہے، اس سے ظاہر ہوا کہ درحقیقت قلبی جماعتانہ بھی اہم زمانہ ہیں۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ۔

نصیر الدین فصیح ہونزائی

۲۰۔ دسمبر ۱۹۸۴ء

## تاویلی سوالات

سورہ مائدہ (۵) کا چوتھا رکوع (یعنی ۲۰-۲۴) پیش نظر رہے، اور اس سلسلے میں یہاں چند تاویلی سوالات اور جوابات درج کئے گئے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:-

سوال (۱): **يَجْعَلْ فِيكُمْ انبياء** (اللہ تعالیٰ نے تم میں بہت سے پیغمبر بنائے) کی تاویلی وضاحت کزن طرح ہو سکتی ہے، کیونکہ ”فیکم“ کے معنی ”تمہاری قوم میں“ تک محدود نہیں، بلکہ اس کا مطلب ”تمہاری ذات میں“ بھی ہے؟

جواب: کوئی شک نہیں کہ بنی اسرائیل میں بہت سے انبیاء علیہم السلام ہوئے تھے، اور یہ بات عالم ظاہر سے متعلق ہے، لیکن جہاں تک عالم شخصی کا تعلق ہے، تو اس میں جملہ پیغمبروں کی نمائندگی نفس واحد کرتا ہے، چنانچہ فیکم کے معنی مطلق ہیں (یعنی محدود نہیں)، لہذا اس پر حکمت آسمانی تعلیم میں بنی اسرائیل سے یہ فرمایا گیا تھا، کہ وہ بذریعہ علم و عمل حد قوت سے حد فعل میں ترقی کر کے دیکھیں کہ رب کریم کی

طرف سے انھیں کسی کسی عظیم نعمتیں عطا کی گئی ہیں، کہ ان کے باطن میں ایک ایسا عالم پوشیدہ ہے، جس میں ماضی اور مستقبل اپنی اپنی جگہ سے ہٹ کر حال کے طور پر سامنے آتے ہیں، یہاں یہ اصول خوب یاد رہے کہ قرآن حکیم میں جہاں جہاں ”فیکم“ ہے، اس میں یہی حکمت پوشیدہ ہے۔

سوال (۲): آیا زمانہ ماضی میں نبوت کے علاوہ دنیوی قسم کی بادشاہت بھی ممکنہ ہوتی تھی؟ اگر نہیں تو یہ قرآنی ارشاد کیوں ہے کہ خداوند تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لوگوں کو ملوک (بادشاہ ۲۰) بنایا تھا؟

جواب: خدا کے نزدیک نبوت اور امامت کے سوا کوئی حقیقی بادشاہت نہیں، اور جس طرح بنی اسرائیل کے ملوک (بادشاہ) ہونے کا ذکر ہے اس کی دو تاویلیں ہیں، اول یہ کہ ان کی قوم سے ایک شخص کا بادشاہ (امام) ہونا گویا ان کا بادشاہ ہونا تھا، دوم یہ کہ وہ اپنے اماموں کے وسیلے سے بحمد قوت بادشاہ تھے، جبکہ حضرات ائمہ بحمد فعل دینی بادشاہ ہو کرتے ہیں، جس طرح درخت بحمد فعل درخت ہوتا ہے، مگر اس کا تخم بحمد قوت درخت ہوتا ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا ہے: سو ہم نے ابراہیم کے خاندان کو کتاب بھی دی ہے اور حکمت بھی دی ہے اور ہم نے ان کو بڑی بھاری سلطنت بھی دی ہے (۲۵) اس حکم میں پہلے نبوت کا ذکر ہے، اس کے بعد امامت کا۔

سوال (۳): ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا حکم صرف اور صرف خاندان

ابراہیم علیہ السلام کے لئے خاص ہے، اور اس میں کسی اور شخص کی شرکت نہ تو حدِ فعل میں ہو سکتی ہے اور نہ حدِ قوت میں، پھر دوسرے لوگوں کا وسیلہ نجات کیا ہے؟

جواب: جو لوگ انبیاء و ائمتہ علیہم السلام کی حقیقت پیروی کرتے ہیں، وہ ان حضرات کی روحانی ذریت (اولاد) قرار پاتے ہیں جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے فرمایا گیا ہے: **فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي** (۱۳۶)۔ پس جو کوئی میری پیروی کئے تو وہ مجھ سے ہے۔ جس طرح حضرت نوح علیہ السلام کا ایک بیٹا نافرمانی کی وجہ سے پیغمبر کا فرزند نہ ہو سکا، اور جس طرح اس کے برعکس تابعداری کے سبب سے سلمان فارسی اہل بیت رسولؐ سے جہا ملا، ان روشن مثالوں سے دین کا یہ قانون ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس میں یہ ممکن ہے کوئی شخص یا اشخاص بسبب نافرمانی نبوت و امامت کے خاندان سے خارج ہو جائیں، اور دوسری جانب یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی فرد یا افراد اطاعت و فرمانبرداری کی بدولت پیغمبر اور امام کے روحانی فرزند قرار پائیں۔

سوال (۴): آیت کریمہ کا ترجمہ ہے: اور تم کو وہ چیزیں دیں جو دنیا جہان والوں میں سے کسی کو نہیں دیں (۵۰) کیا اس قرآنی تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ بنی اسرائیل کو عطا ہوا تھا، وہ اولین و آخرین میں سے کسی کو نہیں دیا گیا تھا؟ اگر حقیقت یوں ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا یہ اختصاص صرف حضرت موسیٰؑ کی قوم کے لئے کیوں ہے؟

جواب: آیت مقدسہ کی حکمت یہ بتاتی ہے کہ بنی اسرائیل کے اس

تذکرے میں اُن تمام لوگوں کی مثال دی گئی ہے، جن کو اپنے اپنے دور میں انبیاء و اولیاء دُائِمہ کی ظاہری نزدیکی حاصل تھی، مگر ہر زمانے میں رحمتِ خداوندی کو فعلاً حاصل کرنے کے لئے علم و عمل ضروری ہوتا ہے، پس بنی اسرائیل کو اولین و آخرین پر نہیں بلکہ اہل زمانہ پر فضیلت دی گئی تھی، اور وہ بھی بحقیقت فرمانبردار ہونے کی صورت میں، جیسا کہ آپ قرآن حکیم میں دیکھتے ہیں۔

سوال (۵) : آیتِ کریمہ (۲۱) کے مطابق "ارضِ مُقدَّسہ"

کی تاویل کیا ہے؟ جب اللہ تعالیٰ نے یہ پاک زمین بنی اسرائیل کے نام پر لکھ دیا تھا، تو پھر وہ لوگ اس میں کیوں داخل نہیں ہو سکتے تھے؟

جواب ہے : ارضِ مُقدَّسہ کی تاویل رُوحانیت اور عالمِ شخصی ہے،

جس کو خدا تعالیٰ نے ہر مسلم اور مومن کے نام لکھ دیا ہے، لیکن ہر رحمت و نعمت پہلے تو حدِ قوت میں ہوا کرتی ہے، جس کو حدِ فعل میں لانے کے

لئے علم و عمل کی سخت ضرورت ہوتی ہے، اگر یہ نہ ہوا تو کوئی رحمت اور

کوئی نعمت اپنے آپ حدِ قوت سے حدِ فعل میں نہیں آ سکتی ہے، جس کی

ایک مثال گندم کے بیج ہیں، جو بحدِ قوت کسی زمیندار کے سال بھر کا غلہ

اور سرمایہ ہیں، اب آپ خود بتائیے کہ کھیت میں بیج بکھیرنا، ہل چلانا،

وغیرہ زمیندار کا کام ہے یا خدا کا؟ تاکہ یہ بیج حدِ قوت سے حدِ فعل میں

آ کر گندم کا ایک بڑا ذخیرہ بن سکیں، ظاہریات ہے کہ اللہ تعالیٰ جو

صاحبِ حکمت ہے صرف اپنا کام کرتا ہے وہ ظاہری اور جسمانی کام

نہیں کرتا، اُس نے اپنی قدرتِ کاملہ سے انسان کو بے شمار عقلی، روحی



اور جسمی عمل کی صلاحیتوں سے نوازا ہے، پس علم و عمل میں انسان کی سعادت پلوشیدہ ہے۔

سوال (۶) : قرآن حکیم کی کئی آیات میں خاص ترین یعنی زیانکاروں کا بھی ذکر ہے، اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ لوگ اچھے اچھے کام انجام دیں، اور اللہ تعالیٰ ان کو کوئی اجر و صلہ نہ دے، پھر وہ لوگ زیانکار کہلائیں؟

جواب : اگر کسی انسان کا قول و فعل خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توشہ و دی کے مطابق ہے تو وہ مقبول و مفید ہوتا ہے، ورنہ وہ ضائع ہو جاتا ہے، اور خدا کی سنت ہمیشہ سے ہی چلی آتی ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ دین کی ہر بات اور ہر کام نور ہدایت کی روشنی میں ہونا چاہیے، تاکہ موجب ثواب ہو، کیونکہ نور ہدایت کے ہمیشہ کے لئے موجود و حاضر رہنے کے یہی معنی ہوتے ہیں۔

سوال (۷) : اگر ارض مقدسہ سے رُوحانیت اور عالم شخصی مُراد ہے، تو اس میں وہ زبردست لوگ کون تھے، جن کے خوف سے بنی اسرائیل اُس پاک سرزمین یا اُس پاک عالم میں داخل نہیں ہو سکتے تھے؟

جواب : اُن سرکش لوگوں کی تاویل، جو پاک و پاکیزہ زمین پر قابض تھے، ظاہری طاغوتی قوتیں ہیں، جو نفسِ امارہ کے توسط سے انسان کے باطن میں کام کرتی ہیں، جن کی موجودگی میں کمزور مومن عالم

شخصی میں داخل نہیں ہو سکتا ہے، اور آئیہ کریمہ میں اسی مطلب کی ترجمانی کی گئی ہے (۲۲)

سوال (۸) : وہ دو مرد کون تھے؟ جنہوں نے اپنی قوم کو باطنی جہاد کے لئے حوصلہ دیا؟ اور وہ دروازہ کیا تھا، جس سے لوگوں کو رُوحانیت میں داخل ہو جانا چاہیے؟

جواب : وہ دو مرد جو خوفِ خدا رکھتے تھے، اور جن پر اللہ کا فضل و احسان تھا، وہ اساس اور امام علیہما السلام تھے، اور وہ دروازہ جس سے شہرِ رُوحانیت میں داخل ہو جانا چاہیے، بابِ امامت (مُجْتَبِ اعْظَم) تھا، کیونکہ اللہ جَلَّ شَانَهُ، کا باب (دروازہ) ناطق ہوا کرتا ہے، ناطق کا باب اساس، اساس کا باب امام، اور امام کا باب مُجْتَبِ اعْظَم ہوتا ہے، جس سے امامِ برحق کا وہ فرزند مُراد ہے، جو وقت آنے پر مرتبہ امامت پر فائز ہو جاتا ہے۔

سوال (۹) : خدا، رسول، اور امام کے دروازے کیوں ہیں؟ اور ان کی خصوصیت کیا ہے؟ کیا اس تصور کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص خدا تک پہنچ جاتے؟

جواب : دیکھتے کہ خدا تعالیٰ مکان و لامکان سے برتر بھی ہے وہ ہر جگہ بھی ہے، اور اس کا ایک مقرّر گھر بھی ہے، چنانچہ اول الذکر دونوں تصور ایسے نہیں کہ کوئی بسوا کا اُن سے خدا تک رسائی کر سکے، لہذا ضروری ہے کہ خانہ خدا سے رجوع کیا جائے، اور خانہ خدا دروازے

کے بغیر نہیں ہو سکتا، جیسے پیغمبر اکرمؐ نے ارشاد فرمایا کہ: میں حکمت کا گھر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ مراتبِ عالیہ کے روانے منارہ ہدایت کے طور پر ہیں، اور ان کی خاصیت علم و حکمت ہے، پس اس تصور کے بغیر خدا شناسی ممکن نہیں، یعنی خدا کا دروازہ پیغمبر اور پیغمبر کا دروازہ امام ہے اور راہ ہدایت کا قانون یہی ہے۔

سوال (۱۰): اس ارشادِ خداوندی میں کیا حکمت ہے، جو فرمایا گیا ہے: ”پس جب تم دروازے سے داخل ہو جاؤ گے تو اسی وقت غالب آؤ گے؟“

جواب: حُجَّتِ عَظْمِ جِوَامِ اِقْدَسِ وَاطْهَرِ عَلَیْہِ السَّلَامِ کا رُوحانی دروازہ ہے، اس کے وسیلے سے امامِ عالی مقامؑ کی رُوحانیت میں داخل ہو جانے کے نتیجے میں بندہ مومن کا شخصی عالم فتح ہو جاتا ہے، اور تمام طاغوتی طاقتیں مغلوب ہو جاتی ہیں۔

سوال (۱۱): اس پاک آیت میں جس طرح توکل کا ذکر رُوحانی فتح کے بعد آیا ہے، اس میں کیا حکمت ہے؟

جواب: چونکہ توکل ایمان کے درجہ کمال پر ہے، لہذا اس کا ذکر اسی طرح آخر میں آیا ہے، یعنی مومن جب اپنے عالمِ شخصی میں داخل ہو جاتا ہے تو تب حقیقی وکیل کار سازی کرتا ہے۔

نصیر الدین نصیر ہونزائی

## سلمانِ فارسی

ا۔ لفظِ سلمان کا مادہ سے لے کر ہے، چنانچہ اس کے خاص مفہومات یہ ہیں: سلامتی والا، ناجی، تسلیم و تقویٰ کرنے والا، یعنی اپنی انا کو خدا کے سپرد کر دینے والا، صلح جو، امن پسند، اطاعت گزار، فرمانبردار، وغیرہ، چونکہ حرفی لحاظ سے ”سلمان“ کا اسم مُصَغَّرٌ یا التَّصْغِيرِ (DIMINUTIVE) سلیمان ہے، لہذا یہ کہنا ایک حقیقت ہے کہ اس خوبصورت اور پیارے نام کی قرآنی بہشت، یعنی حکمتوں کی جنت وہ قصہءِ قرآن ہے، جو حضرت سلیمان علیہ السلام سے متعلق ہے، کیونکہ یہ عزیز نام (یعنی سلمان الخیر) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رکھا تھا، جبکہ سلمانِ فارسی کا سابق نام روزبہ یا ماہہ تھا، اور اس بات میں کسی مسلمان کو کوئی شک نہیں کہ حضورؐ انورؑ کا فرمایا ہوا ہر لفظ ایک طرح کی آسمانی وحی کا درجہ رکھتا ہے (۳۴-۵۳) اس وجہ سے یہ نام بابرکت اور پر حکمت ہو گیا، اگرچہ یہ نام پہلے ہی سے لوگوں میں رائج تھا، لیکن جس وقت اس کا تسمیہ (نام رکھنا) انورؑ نبوت کی روشنی میں کیا گیا، تو اس کے مرادى معنی لغوی مناسبت کے

ساتھ ساتھ کچھ اور ہو گئے، وہ یہ کہ سلمان کے نام میں حضرت سلیمان کی رُوحانی سلطنت کا تصور آگیا۔

۲۔ آپ نے شاید ”حکمتِ تسمیہ“ کے مضمون کو غور سے پڑھا ہوگا، کہ تسمیہ میں کوئی تصور، کوئی حکمت اور کوئی فلسفہ ہوا کرتا ہے، بالفاظِ دیگر نام رکھنے کے پس منظر میں کسی اُمید کا ذکر ہوتا ہے یا کوئی سعادت و بہتری مطلوب ہوتی ہے، اور اگر یہ کام ہادی برحق کا ہے تو یقیناً اس میں اعلیٰ درجے کی حکمتیں پوشیدہ ہوتی ہیں، چنانچہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو پندیدہ نام اپنے عاشق صادق کو دیا ہے، اس میں دینی کامیابی، طُورِ نُور، دیدارِ اقدس اور رُوحانی سلطنت کی بشارت کیوں نہ ہو۔

۳۔ سلمانِ فارسی ارادۃ الہی کے مطابق نُورِ نبوت اور نُورِ امامت کی ایک خصوصی پیداوار تھے، لہذا ان کی تاریخ میں بذریعہ دینداری اور اہل بیتِ اطہار سے وابہانہ محبت کی درخشاں مثال موجود ہے، ہمیں نظامِ ہدایت کے باطنی پہلو کے بارے میں بھی سوچنا چاہیے کہ کس طرح سلمانِ فارسی کے دل میں تلاشِ حقیقت کا طوفانی شوق ابھرا؟ وہ کون سی ہستی تھی جس نے شہرِ اصفہان کے ایک مجوسی (آتش پرست) فرزند کے دل و جان میں ایسی آتشِ عشق جلائی؟ یقیناً کوئی ایسا ہمہ گیر وسیلہ تھا، جس کو نُورِ ہدایت کہنا چاہیے۔

۴۔ کتاب ”بخاری“ حصہ اول کے شروع میں حدیثِ نبوی ہے:

وَأَحْيَا نَا يَتَّمَثَلُ لِي الْمَلَكُ رَجُلًا۔ اور کبھی فرشتہ آدمی کی صورت میں میرے پاس آتا ہے اور مجھ سے کلام کرتا ہے، اس ارشاد میں آپ دیکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے پاس بعض دفعہ جبرائیلؑ ایک مرد کی شکل میں وحی لے کر آیا کرتا تھا، لیکن عقل پوچھتی ہے کہ فرشتہ کس مرد کی صورت میں آتا تھا؟ اس کے جواب میں قانونِ روحانیت کہتا ہے کہ ویسے تو عظیم فرشتہ جملہ مومنین کا آئینہء روح ہوا کرتا ہے، اس لئے اس کا ظہور ایک مشترکہ صورت میں ہوتا ہے، تاکہ وحدتِ ارواح کی حقیقت ظاہر ہو جائے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جبرائیلؑ رسول کریمؐ کے پاس سلمان فارسی کی روحانی شکل میں آیا کرتا تھا، اور بعض کہتے ہیں کہ یہ ظہور بدحیثہ کلبی کی صورت میں ہوتا تھا۔ میں عرض کرتا ہوں کہ اس میں کوئی تضاد نہیں، جبکہ روح القدس میں سب ہیں،

۵۔ سنن ابن ماجہ، جلد اول، باب ۲۴، حدیث ۱۵۵ میں ارشاد ہے: **إِنَّ اللَّهَ أَمَرَنِي بِحُبِّ آدْبَعَةَ وَأَخْبَرَنِي أَنَّهُ يُحِبُّهُمْ قِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَنْ هُمْ؟ قَالَ عَلِيُّ مَتَّهَمٌ يَقُولُ ذَاكَ شَدَاةً وَأَبُو ذَرٍّ وَسَلْمَانَ وَالْمِقْدَادَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ** نے ارشاد فرمایا: اللہ نے مجھے پارسوں سے محبت کرنے کا حکم دیا، اور یہ تبصرہ دی ہے کہ وہ بھی ان سے محبت رکھتا ہے، صحابہ نے عرض کیا: **يَا رَسُولَ اللَّهِ وَهَ كَوْنُ هُنَّ؟** آپ نے فرمایا: **عَلِيٌّ** بھی ان میں سے

ہے، اور یہ بات آپ نے تین بار فرمائی، اور ابوذر، سلمان، اور مقداد ہیں۔

۴۔ یہ جاننا ضروری ہے کہ ایک تو ہوتا ہے خدا کا عام طور پر سب مومنوں سے محبت کرنا، اور دوسرا ہوتا ہے اس کا خاص طور پر چند سے محبت کرنا، چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ مذکورہ حدیث میں صرف چار ہستیوں سے اللہ تعالیٰ کی محبت کا ذکر ہے، اس سے ظاہر ہوا کہ یہ خصوصی محبت کی بات ہے، جس میں مولا علی صلوات اللہ علیہ کی شانِ اقدس تالیان و درخشان ہے، اب آپ کو اس ارشاد نبوی کی روشنی میں متعلقہ آیات قرآنی کا بغور مطالعہ کر کے یہ دیکھنا ہے کہ خدا تعالیٰ کن لوگوں سے محبت دوستی کرتا ہے، آپ قرآن میں دیکھیں گے کہ پروردگار عالم ان حضرات سے محبت کرتا ہے جو بحقیقت متقی ہیں (۲/۲۶۴)، ان مومنین سے دوستی کرتا ہے جو اس کے رسول کے فرمان بردار ہیں (۳/۱۳۱)، ان بندوں کو چاہتا ہے جو نیکو کار ہیں (۳/۱۳۴)، خدا ان لوگوں کا دوست ہے جو عالی ہمت اور صابر ہوا کرتے (۱۳۴/۱)، خدا در رسول ان اشخاص سے محبت کرتے ہیں، جو مقام توکل پر ہیں (۱۵۹/۲)، جو عادل ہیں (۴۲/۵)، اور جو پاک و صاف ہوا کرتے ہیں (۱۰۸/۹)۔

۷۔ رزقوۃ احزاب (غزوۃ خندق) میں سلمان فارسی کے بارے میں رسول اکرم نے ارشاد فرمایا: **سلمان ہذا اہل البیت**۔ سلمان ہم اہل بیت میں سے ہے۔ یہاں ہمیں کس طرح سوچنا چاہیے؟ کیا ایسے خاص موقع پر آقا اور غلام ایک دوسرے کے انتہائی قریب نظر نہیں آتے ہیں؟ آیا اس پر حکمت حدیث کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے

ہیں کہ سلمان فارسی جیتے جی فسور میں فنا ہو گئے تھے؛ وہ اپنی پاک پاکیزہ رُوح کو دُاُس کیفیت میں جس میں کہ نہ مکان ہے نہ زمان، ازلی وابدی طور پر اصل سے داخل دیکھتے تھے، اور یہ سب کچھ اس وجہ سے حاصل ہوا تھا کہ آپ کے دل میں ہمیشہ پیغمبر اور امام کا دریا تے عشق موجزن رہتا تھا، آپ اپنے باطن میں ایک روشن دُنیا تھے، آپ کے سینے میں علم و عرفان کے بیش بہا خزانے پوشیدہ تھے۔

۸۔ اس حدیث شریف میں، جو سلمان فارسی سے متعلق ارشاد ہے، یہ واضح اور قابل فہم مثال موجود ہے کہ اگر مومنین چاہیں تو عالی ہمتی، سخت محنت، جان فشانی، جذبہ قربانی، اور حقیقی محبت سے کام لے کر نور سے اپنا رشتہ جوڑ سکتے ہیں، یعنی وہ چشم باطن سے یہ دیکھ سکتے ہیں، کہ کس طرح ان کی اناتے علوی ازلی طور پر اصل سے داخل و وابستہ رہی ہے، یہ کام اگر مشکل ہے لیکن ناممکن ہرگز نہیں، جیسے قرآن حکیم کا ارشاد ہے، جس میں اسی قانون دین سے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ترجمانی کی گئی ہے: **فَمَنْ تَبِعَنِي فَآنَسْ**، یعنی (۱۷/۱۲) پس جو کوئی میری پیروی کرے وہ مجھ سے ہے۔ یعنی جو شخص اُس راہ پر گامزن ہوتا جاتے، جس پر میں چلا ہوں، تو ایک دن اس کو یہ بھید حقیقت معلوم ہو جائے گا کہ کس طرح وہ میرا روحانی اور نورانی فرزند ہے، پس یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شخص چاہے تو سلمان کی طرح اپنا ازلی رشتہ نور کے ساتھ جوڑ سکتا ہے، اور جو اس کے برعکس چاہے وہ کنگان دپسر



نور، کی طرح اس رشتے کو توڑ سکتا ہے۔

۹۔ سوال: آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلمان فارسی کو کس معنی میں اہل بیت اطہار کے ایک فرد کا درجہ دیا؟ اس میں "بیت" سے کون سا گھر مراد ہے؟ آیا آیہ تطہیر میں نجات پاؤں کے ساتھ سلمان فارسی کا بھی ذکر موجود ہے؟ کیا اس آیہ مبارکہ میں جملہ آنے والے ائمہ ہدٰی صلوات اللہ علیہم کا ذکر موجود ہے؟

جواب: پیغمبر خدا نے سلمان کو جس طرح اہل بیت پاک میں شامل کر لیا، اس کے معنی یہ ہیں کہ سلمان فارسی بوسیلہ مطاعت و فرمانبرداری خانہ نورانیت میں داخل ہو کر نجات کے ہمنشین ہو گئے تھے، یہاں بیت سے خانہ نور و نورانیت مراد ہے، جی ہاں آیہ تطہیر میں سلمان کا بھی ذکر ہے، ہر چند کہ ظاہراً عمل کساء سے ایسا نہیں لگتا ہے، کیونکہ وہ کام محض ایک علامت کے طور پر تھا، اُو ان حضرات کی تطہیر دراصل جُدا جُدا وقتوں میں فرداً فرداً ہوتی تھی جی ہاں، آیہ تطہیر میں تمام پاک اماموں کا ذکر موجود ہے، کیونکہ بعد کا ہر امام بھی اسی خانہ نور میں رہتا ہے، جس میں نجات پاؤں رہتے تھے لہذا ہر امام پر اہل بیت کا اطلاق ہو جاتا ہے۔

۱۰۔ اگر دنیا کا کوئی بادشاہ کسی غریب سے دوستی کرنے لگتا ہے، تو پھر وہ شخص غریب نہیں رہتا، رفتہ رفتہ امیر بن جاتا ہے، چنانچہ جب یہ حقیقت ہے کہ خدا و رسولؐ سلمان سے محبت کرتے تھے اور ان

کا نام حضرت سلیمانؑ کے نام مبارک پر رکھا گیا تھا، تو پھر اس کے معنی یہ ہوتے کہ اللہ اور اس کے سنجیدہ مسلمان کو عالم شخصی میں سلیمان بنانا چاہتے تھے اور خدا تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے (۱۴۲)

۱۱۔ خدائے حکیم نے رُوحِ نیا کی وجہ سے نباتات کو جمادات پر فوقیت دی ہے، رُوحِ حیوانی کے سبب سے جانوروں کو نباتات پر فوقیت دی ہے، رُوحِ ناطقہ کی بدولت انسانوں کو حیوانات کا بادشاہ بنا دیا، رُوحِ الایمان کے وسیلے سے مومنین کو لوگوں پر برتری دی، اور رُوحِ قدسی یا نور کے ذریعے سے حضراتِ انبیاء و ائمہ علیہم السلام کو مومنین پر فضیلت بخشی ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے: اور ہم نے داؤدؑ اور سلیمانؑ کو (رُوحانی) علم عطا فرمایا اور ان دونوں نے کہا کہ تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے ہم کو اپنے بہت سے ایمان والے بندوں پر فضیلت دی (۱۵۴)

اس ربانی تعلیم میں، جو حکمت سے مملو ہے، آپ دیکھ سکتے ہیں کہ مومنین پیغمبروں اور اماموں کے انتہائی قریب ہیں، اس معنی میں کہ انبیاء و ائمہ ان سے افضل ہیں، جبکہ اہل ایمان دُنیا والوں سے افضل ہیں، جس طرح بنی اسرائیل سے اس کی مثال ملتی ہے (۱۴۲، ۱۴۳) کہ وہ اپنے وقت کے مومنین ہونے کی وجہ سے اہل بہان پر فضیلت رکھتے تھے۔

۱۲۔ سوال: جب حضرت سلیمانؑ حضرت داؤد کے قائم مقام (جانشین) ہو گئے، تو انھوں نے دعوتِ حق کا اعلان اس طرح کیا: اے لوگو ہم کو پرندوں کی بولی کی تعلیم کی گئی ہے اور ہم کو ہر چیز سے دی

گئی ہے (۱۶) اس میں پوچھنا یہ ہے کہ آپؐ نے دینی دعوت میں اپنی سلطنت کو کیوں موضوع بنایا؛ لوگوں کو اس سے کیا تعلق تھا؛ آیا پزندوں کی بولی کی کوئی تاویل ہے؛ انھوں نے ”مجھ کو“ کی جگہ ”ہم کو“ کیوں کہا؛ ہر چیز کا مطلب گل کائنات ہے، سو گل کائنات سے ان کو کیا دیا گیا تھا۔

جواب: حضرت سلیمان علیہ السلام نے دعوت کا جو طریقہ اختیار کیا وہ منشاءتے الہی کے عین مطابق تھا، آپؐ تمام انبیاء و ائمہ علیہم السلام اور مومنین کی روحانی بادشاہی کی جیتی جاگتی تصویر تھے، لہذا یہ امر بہت ہی ضروری تھا کہ لوگوں کو مملکت بہشت کا ذکر کر دیا جائے، جس سے لوگوں کا تعلق ہے، پزندوں سے ارواحِ خلاق مراد ہیں، جن سے بہشت روحانیت میں گفتگو ہوتی ہے، اس کے علاوہ اس میں ظاہری پرندے بھی ہیں، اور ”مجھ کو“ کی جگہ ”ہم کو“ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ آپؐ اس روحانی سلطنت کے بیان میں تمام کامل انسانوں کی طرف سے نمائندگی کر رہے تھے، دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ آپؐ کے ساتھ حدودِ دین تھے، اور ہر چیز سے یا گل کائنات سے جو کچھ ان کو دیا گیا تھا، وہ عالم شخصی تھا، جو گل عالم کی ایک زندہ تصویر کی حیثیت سے ہوتا ہے۔

۱۳۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصہء قرآن میں جہاں تمام حکمتوں کا مرکز ہے، اور جس سے یہ حکمتیں پھیل کر متعلقہ قصے کو مکمل کر دیتی ہیں، وہ مرکز یہ ہے: **وَ اَوْتَيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ** (اور ہم کو ہر چیز سے دی گئی ہے) اور باقی جو کچھ ہے وہ اسی کی وضاحت

ہے، چنانچہ کل شیء کے معنی ہیں تمام عقلی، رُوحی، اور جسمی چیزوں کا مجموعہ، یعنی پوری کائنات جس کی عقل، جان، اور جسم ہے، اور من کل شئی کا مطلب ہے اس کائنات کی ایک لطیف زندہ تصویر، یعنی عالم شخصی، جس میں سب کچھ ہے، اور یہ حقیقت وہی ہے جو سورۃ یاسین (۱۲) میں امام مبین کے بارے میں مذکور ہے، مطلب یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ امام تھے، لہذا ان کی ذات میں کائنات و موجودات کی لطیف صورت سے عالم شخصی بنایا گیا تھا۔

۱۴۔ سوال: وَحُشِرَ لِسُلَيْمَانَ..... فهِم يُوزَعُونَ

(۲۷) اور سلیمان کے لیے ان کے لشکر جمع کئے گئے تھے، جو جنات اور انسانوں اور پرندوں میں سے تھے اور وہ مکمل ضبط میں لاتے جاتے تھے۔ آپ اکثر کہتے ہیں کہ قرآنی الفاظ کے آپس میں معنوی ربط و رشتہ ہوا کرتا ہے، تو بتائیے کہ اس آیہ مقدسہ میں جس طرح لفظ "حشِر" آیا ہے، اور جیسے قرآن پاک کے بہت سے مقامات پر قیامت کا ایک نام "حشر" ہے ان دونوں کے درمیان کیا مناسبت ہے؟ سلیمان علیہ السلام کے یہ لشکر کہاں سے جمع کئے گئے؟ یوزعون کے کیا معنی ہوتے ہیں؟

جواب: ان دونوں لفظوں کے درمیان انتہائی ربط و رشتہ یہ ہے کہ یہ لفظاً و معناً ایک ہی ہے، کیونکہ یہ حضرت سلیمانؑ کی ذاتی قیامت کا واقعہ ہے، جس میں رُوحانی طور پر آپ کے لشکر بصورت ذرات جمع ہو گئے، یہ ذرات خلقات میں پوشیدہ تھے، قرآن حکیم میں یہ لفظ (حشر) اپنی مختلف شکلوں میں کل ۴۳ بار آیا ہے، اور ہر مقام پر قیامت ہی کے معنی ہیں

ہے، یہاں تک کہ قصہ فرعون میں جہاں جہاں لفظ "حشر" استعمال ہوا ہے وہ بھی حضرت موسیٰؑ کی انفرادی اور شعوری قیامت کی بات ہے، جس میں ساحر و کوشکست ہوتی تھی، یوزعون میں کئی معنی جمع ہیں، جیسے نظم کرنا، ترتیب دینا، کنٹرول کرنا، وغیرہ، کیونکہ جب انسان کامل کی روحانیت میں صورت بننے لگتا ہے تو اس کی انفرادی قیامت برپا ہو جاتی ہے، اور اس کے لشکر جنوں، اور پرندوں (یعنی فرشتوں) میں سے جمع ہو کر روحانی جہاد کی پوزیشن لیتے ہیں، تاکہ خدا کا دین ادیان عالم پر غالب ہو (۳۳، ۹، ۲۸، ۹۱)

۱۵۔ سوال: یہ ہمارے نزدیک بہت ہی عجیب بات ہے کہ

آپ نے روحانی جہاد کا تصور پیش کیا، کیا آپ اس سلسلے میں ہمیں کچھ مثالوں اور دلیلوں سے مزید سمجھا سکتے ہیں کہ یہ جہاد کس طرح ہے؟

جواب: قرآن حکیم میں جا بجا باطنی اور روحانی جہاد کا ذکر موجود

ہے، یہ مقدس جنگ ظہور اسلام سے پہلے بھی تھی، زمانہ نبوت میں بھی اور اب بھی ہے، مگر یہاں یہ بات یاد رہے کہ جہاد ظاہر اور باطنی پیغمبرؐ اور امام برحقؑ کے ذریعے سے ہو سکتا ہے، چنانچہ قرآن پاک میں جہاں جہادِ خدائی لشکر یا آسمانی جنگ کا ذکر کیا گیا ہے، وہاں اسی روحانی جہاد کی نشاندہی کی گئی ہے، جیسے سورۃ فتح (۲۸، ۲۸) میں ارشاد ہے:

وَلِلّٰهِ جُنُودَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ - اور آسمانوں اور زمین کے لشکر اللہ ہی کے ہیں۔ سماوی لشکر فرشتے ہیں، اور ارضی لشکر حجج و راسخین ہیں، اور کسی بادشاہ یا حکومت کی فوج جنگی مقصد کے سوا نہیں

ہوتی، اسی طرح سورۃ صافات (۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳) میں فرمایا گیا ہے: اور ہمارے خاص بندوں یعنی پیغمبروں کے لئے ہمارا یہ قول پہلے ہی سے مقرر ہو چکا ہے کہ بیشک وہی غالب کئے جائیں گے اور دہریاں ہمارا ہی لشکر غالب رہتا ہے۔ اس کے علاوہ سورۃ مائدہ (۵۶) میں جزب اللہ خدا کا گروہ کے معنی میں لشکر خدا کے غالب و فاتح ہونے کا بیان ہے، اسی سورہ (۵۶) میں ایک ایسی قوم کے آنے کی بشارت ہے کہ اُن سے اللہ تعالیٰ کو محبت ہوگی اور انکو اللہ تعالیٰ سے محبت ہوگی، وہ مومنین پر مہربان ہوں گے اور کافروں پر سخت گیر ہوں گے وہ خدا کی راہ میں جہاد کریں گے (۵۶) اس حکم میں آپ واضح طور پر دیکھ رہے ہیں کہ جن کے ظہورِ روحانی کی خوشخبری دی گئی ہے، وہ لوگ نیک ظاہر کے مسلمین و مومنین سے افضل ہیں، جبکہ وہ اہل ایمان پر بڑے نرم دل اور مہربان ہیں، اور جہاد کرنے والے ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ یہ روحانی لشکر ہی ہیں، جو ہر زمانے میں نورِ ہدایت کے تحت اپنا حربی عمل انجام دیتے رہتے ہیں، اس سلسلے کے قرآنی حوالے بہت زیادہ ہیں، لہذا روحانی جہاد پر کوئی الگ مضمون ہونا چاہیے۔

۱۶۔ سوال: سورۃ نساء کے ایک ارشاد (۴۸) میں یقیناً درجہ دار پیغمبروں، صدیقوں، شہیدوں، اور صالحوں کے بعد فرمایا ہے مومنین کا ذکر فرمایا گیا ہے، اس سے صاف طور پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ صالحین عام مومنین سے آگے ہیں، اُن سے شہداء آگے ہیں، شہیدوں سے صدیقین آگے ہیں، اُن سے انبیاء آگے ہیں، لیکن

مراتب کے اس تعین کے باوجود اس کی کیا وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جسمانی زندگی کے اختتام پر صالحین یعنی نیکو کاروں میں داخل ہو جانا چاہتے تھے؟ جیسے حضرت سلیمانؑ نے اس مقصد کے لئے دُعا کی (۲۴/۱۹) آپ قرآن حکیم میں دیکھیں: (۲/۱۳۰، ۱۰/۱۲۲، ۱۶/۸۳، ۲۶/۹، ۲۹/۲۷)

جواب: بے شک آیہ کریمہ (۲/۱۳۰) میں جس ترتیب سے درجات

جسمانی کا ذکر فرمایا گیا ہے، وہ حقیقت ہے، کیونکہ اس میں سب سے پہلے ناطقوں (نبیین) کا ذکر ہے، پھر اساسوں (صدیقین) کا، پھر اماموں (شہداء) کا، اور اس کے بعد ابواب (صالحین) کا ذکر ہے اور یہاں یہ بھی یاد رہے کہ ہر ناطق کا باب اساس ہوتا ہے، ہر اساس کا باب امام ہوتا ہے، اور ہر امام کے لئے باب اس کا وہ فرزند ہوتا ہے جو تحت امامت کا وارث ہو، سو اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت سلیمانؑ اور دوسرے تمام حضراتِ انبیاء و ائمہ اپنے اپنے باب (صالح) میں زندہ رہنا چاہتے تھے، تاکہ صالحین یعنی نیکو کاروں کا جو سب سے آخری مقصد ہے، اس کے حصول کے لئے عمل کیا جاتے۔

سورہ شعراء (۸۳-۸۴) میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس طرح دُعا کی: اے میرے پروردگار مجھ کو ایک حکم دے یعنی امرِ نیک کی شناخت، عطا فرما اور مجھ کو صالحین دے یعنی میرے اساس = باب سے ملا دے اور میرے لئے آئندہ آنے والوں (یعنی نورِ نبوت و نورِ امامت) میں زیارِ صدق مقرر فرما۔ اس سے یہ حقیقت عیان

ہو جاتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ حکم خدا اپنے نور کو باب یعنی حضرت اسماعیلؑ (جو اساس تھے) میں منتقل کر دینا چاہتے تھے، تاکہ نور اسی طرح سلسلہ صالحین یعنی آئندہ ابواب سے وابستہ رہے۔

۷۱۔ سوال: باب کی اتنی بڑی اہمیت کیوں ہے کہ اس کو صلح کا ٹائٹل دیا گیا ہے؟ اور کیوں ایسا ہے کہ ہر ناطق ہر اساس اور ہر امام اپنے باب میں داخل ہو جاتا ہے؟

جواب: باب کی بہت بڑی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ ناطق کا سارا نورانی عمل اساس کی ذات میں واقع ہوتا ہے، جو ناطق کے لئے باب (دروازہ) ہے، اساس کا نور امام میں کام کرتا ہے جو اساس کا باب ہے اور اسی طرح امام کا نور بھی اپنے اُس فرزند میں کام کرتا ہے جو امام کے باب اقدس کا درجہ رکھتا ہے، اور بعد میں امام مقرر ہونے والا ہے ان تینوں صورتوں میں "نورِ فعال" باب کی مبارک ذات میں ہوا کرتا ہے، جس میں دُنیا اور اہل دُنیا کی صلاح و فلاح پوشیدہ ہے، لہذا سلسلہ ابواب کو صالحین کہا گیا ہے، کہ سب سے زیادہ روحانی حرکت باب میں پائی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ جن معنوں میں اس وسیع و عریض کائنات کو دستِ قدرت میں لپیٹ لیتا ہے، اس میں بہت سے چمکانہ اشارے ہیں، چنانچہ وہ اس میں ہر قسم کی بعید چیزوں کو قریب لاتا ہے، وہ ازل وابد کو یکجا کر کے دکھاتا ہے، ماضی (جس کا اگلا سارا زمانہ آدمؑ ہے) کو لوٹا کر زمانہ حال میں مرکوز



کر دیتا ہے، اور مستقبل بعید کو اجتماعی قیامت سمیت کھینچ کر انفرادی روحانیت میں سما دیتا ہے، اور اگر ہم مانتے ہیں کہ یہ ایک قرآنی حقیقت ہے، تو چلیے اسی قانون کے مطابق یہ بھی مانیں کہ یہ سب کچھ ”نورِ عالی نور“ (۲۴/۳۵) کے مقام پر واقع ہوتا ہے، یعنی روح و روحانیت کی اس منزل میں جہاں ناطق یا اساس یا امام اور باب دو دریاؤں کی طرح باہم مل جاتے ہیں،

(۱۸/۴۰-۴۱)

۱۸۔ سوال: قصۃ سلیمان (۳۴/۲۴) میں ایک امکانی فساد کا بھی ذکر ہے، تو پیغمبر اور امام جیسی مبارک ہستی کے عمل میں کیوں فساد ہونا چاہتے؟ کیا آپ اس بارے میں ہمیں کچھ سمجھا سکتے ہیں یا کوئی حکمت بیان کر سکتے ہیں؟

جواب: فساد (خرابی، بگاڑ) دو قسم کا ہوتا ہے، ایک فساد برائے تخریب ہے، اور دوسرا فساد برائے تعمیر، اگر حضرت سلیمان علیہ السلام ظاہری بہرہ کی غرض سے شہر سبا پر حملہ آور ہو جاتے تو یقیناً وہاں فساد اور بگاڑ ہو جاتا، لیکن ہمیں عقل کی روشنی میں اس بات کا فیصلہ دینا ہو گا کہ ایسا کرنا جائز تھا یا نہیں؟ ملکہ سبا کا یہ کہنا کہ ”جب ملوک (آئمہ) کسی شہر میں داخل ہو جاتے ہیں تو اس کو خراب کرتے ہیں۔“ یہ بات ظاہراً بالکل درست ہے کہ یا بوج و ما بوج (۱۸/۹۴، ۲۱/۹۶) جو امام عالی مقام کے لشکر میں سے ہیں ہر مناسب قریہ ہستی کو تعمیر نو کے پیش نظر زیر و زبر کر دیتے ہیں، لیکن اگر خودی کے بُت کو توڑنے سے خدا مل جاتا ہے، تو پھر اس سے بڑی سعادت

اور کیا ہو سکتی ہے۔

۱۹۔ اس میں بہت بڑی حکمت ہے کہ قرآن حکیم نے کسی بھی کافر حکمران کو بادشاہ (ملک) نہیں کہا، کیونکہ ملک خدا تعالیٰ ہے، اور اس کی جانب سے امام ملک ہے، اگر دوسروں کے بقول کسی باطل شخص کو ملک کہنا مناسب ہوتا تو سب سے پہلے اس کا اطلاق فرعون پر ہوتا، کیونکہ قرآن پاک میں اس کا ایک طویل قصہ آتا ہے، مگر ایسا نہیں ہے، کیونکہ خداوند تعالیٰ کا کلام قانون ہے، لہذا وہ واحد و قہار اپنے قانون سے کسی کافر کی ناجائز حکومت کی توثیق کرنا نہیں چاہتا۔

۲۰۔ سلمان فارسی سے متعلق موضوع میں انبیائے قرآن کی عظیم حکمتوں کو بیان کرنا یہ خود سلمان کی روحانی اور علمی عظمت و بزرگی کا ایک تین تہرت ہے، لہذا آیت ہم ایک بہت بڑی نعمت کی شناخت کر لیتے ہیں وہ بزرگ عظیم (بڑا بھید) سورہ انبیاء (۸۱) کے اس مبارک ارشاد میں پوشیدہ ہے: اور ہم نے اُس (یعنی داؤد) کو ایک قسم کا لباس بنانے کی کاریگری سکھائی تمہارے لئے تاکہ وہ (لباس) تم کو تمہاری لڑائی سے بچائے پس کیا تم شکر کرنے والے ہو؟ یہ کونسی صنعت (کاریگری) تھی، جو خدا تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا؟ آیا یہ زرہ بنانے کی کاریگری تھی؟ آپ اچھی طرح سے سوچ لیں۔

اس ربّانی تعلیم میں جیسا کہ حکیمانہ خطاب فرمایا گیا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ یہ احسان ہر زمانے کے لئے ہے، اور جس نعمت کا یہاں ذکر

ہوا ہے، وہ ایسی نہیں کہ دنیا نے ظاہر کی مادی ترقی اس کی اہمیت، اور قدر قیمت کو کم کر سکے، پس ایسا لباس جو خدا کے بندوں کو جسمانی، روحانی، اور عقلی ہر گونہ جنگوں سے بچا سکتا ہے جسم لطیف ہے، اور یہی اللہ کا سب سے بڑا احسان ہے، اسی لئے شکر کرنے کا ملکہ دیا گیا۔

تاریخ امامت کا مطالعہ حضرت آدمؑ سے شروع کر کے دیکھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمانؑ یکے بعد دیگرے مرتبہ امامت پر فائز ہو گئے تھے، چنانچہ یہ لباس آپ جب بھی دیکھ سکیں امام عالی مقام کا سب سے بڑا معجزہ ہوگا، اور جیسا کہ مذکورہ آیت سے ظاہر ہے امام برحقؑ کی یہ صنعت اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔

۲۱۔ قرآن حکیم میں جگہ جگہ جسم لطیف کا ذکر موجود ہے، اگر صرف روحانی جہاد کی مناسبت سے اس کا بیان مقصود ہے تو ہر ایسی آیت میں ذرا غور کریں، جس میں جنگی الفاظ میں سے کوئی لفظ مذکور ہو، جیسے فرمایا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کر رکھا ہے جن کو تم لوگ (۲۰) اس میں فلکی جسم اور روحانی جہاد کے نتیجے میں دنیا کو فتح کر لینے کی بات ہے، اسی طرح سورہ حدیدہ ۲۵ میں (لوہ) سے یہی کوئی جسم مراد ہے، سورہ نحل (۸۱) میں آپ نے پڑھا ہوگا کہ سراہیل (گرتے) اجسام لطیف ہیں، خود قصبہ سلیمانؑ میں سارے لشکر اسی جسم لطیف کے ذرات ہیں (۲۷) حضرت جبرئیلؑ (۳۹) اور وہ شخص جو کتاب کائنات کی روحانی سائنس جانتا تھا (۴۰) یہی زندہ جسم لطیف تھا، یا بوج و

ماہیوں کا ذکر ہو چکا ہے، یاد رہے کہ جسم لطیف کا ذکر ان لفظوں میں بھی ہے  
جو فرشتوں سے متعلق ہیں۔

غلامِ غلامانِ امامِ زمان

نصیر الدین نصیر ہونزائی

یکم مارچ ۱۹۸۵ء

## پہنچا علی سوالات

سوال ۷۱: رُوح اور مادہ میں سے کون سی چیز پہلے پیدا کی گئی ہے؟  
ان دونوں میں کس کو تقدم شرفی حاصل ہے؟

سوال ۷۲: آپ کہتے ہیں کہ ہر چیز میں رُوح ہے، کیا جمادات میں بھی رُوح ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو وہ رُوح کس نوعیت کی ہے، حالانکہ جماد بیجان چیز کو کہا جاتا ہے؟

سوال ۷۳: آپ نے ”وحدت کثرت نما“ کا تصور پیش کیا ہے اس کی وضاحت کیجئے، تاکہ ہم اچھی طرح سے سمجھ سکیں۔

سوال ۷۴: آپ نے اپنی کسی تقریر کے دوران فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ عدد ایک (یعنی واحد) ہے، لہذا قرآن پاک میں جہاں جہاں خدا کے تمام چیزوں کو شمار کر رکھنے کا ذکر آیا ہے، وہاں ایسے شمار سے ان چیزوں کی وحدت مراد ہے، مگر قرآن میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، جو کثرت کو ظاہر کرتی ہیں، جیسے سات آسمان، وغیرہ، تو کیا سات میں وحدت کی کوئی علامت ہو سکتی ہے!

سوال ۵: براہ کرم عرۃ الوقتی (۲/۲۲، ۳۱) کی حکمت بیان کیجئے، کہ اس کی تاویل کیا ہے؟

سوال ۶: کیا ابراہیمؑ کو کاروں کا اعمال نامہ امام وقت علیہ السلام میں ہوتا ہے یا علیین میں؟ جبکہ امام ایک پاکیزہ شخصیت کا نام ہے اور علیین ایک بلند ترین جگہ ہے (۸۳/۱۸)؟

سوال ۷: آیا صوفیوں کا یہ دعویٰ درست ہے کہ علم تصوف کا سرشمہ مولا علیؑ کی ذاتِ عالی صفات ہے؟ اگر یہ حقیقت ہے تو کوئی مثال پیش کر کے وضاحت کریں۔

سوال ۸: سلام، دارالسلام اور اسلام ان تینوں الفاظ کے معنی اور حکمت بتائیے۔

سوال ۹: ”ایک میں سب اور سب میں ایک“ کی ریاضی تحلیل کر کے سمجھا دیجئے، کہ کس طرح ایک ہستی میں ساری ہستیاں سمائی ہوتی ہیں اور یکسے وہی ایک ہر ہستی میں موجود ہے؟

سوال ۱۰: وہ جامع جوامع جو اب کو نسا ہے، جس میں ہر بڑے سوال کا جواب مہیا ہو؟

سوال ۱۱: خدا اور بندوں کا ازلی اور ابدی رشتہ کیا ہے؟ کیا یہ رشتہ بد عملی کے سبب ٹوٹ جاتا ہے یا ہمیشہ ایک شان سے قائم ہے؟

سوال ۱۲: قرآن حکیم کہتا ہے کہ خدا نے قلم کے ذریعے سے سکھایا (۹۶/۳) مگر یہ بات سب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو

ظاہری قلم سے نہیں، بلکہ بطریقِ وحی سب کچھ سکھا دیا ہے، پھر یہاں قلم سے کیا مراد ہے؟

سوال ۱۳: ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيِّنَاتٍ، (۱۹)، اس آیتِ کریمہ کی تفسیر و تاویل کیجئے۔

سوال ۱۴: خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو کتابِ مُبْتَلٰیٰ (۲۷) عنایت کر دی تھی، یہ کونسی کتاب تھی؟

سوال ۱۵: یہ ہمارا ایمان ہے کہ نور ایک ہے، لیکن ہم ظاہری کتابت میں نور کی کثرت دیکھ رہے ہیں، جیسے سورج، چاند اور بے شمار ستارے، پس یہ تمام چیزیں نورِ واحد کی مثال کس طرح ہو سکتی ہیں؟

سوال ۱۶: ان دونوں طریقوں سے کونسا زیادہ صحیح اور آسان ہے؟

(۱) قرآن سے امام کو پہچاننا۔

(۲) امام سے قرآن کو پہچاننا۔

سوال ۱۷: کیا قرآنِ حکیم میں لامکان، لازمان، ازل اور ابد کا ذکر ہے؟ اگر ہے تو کس طرح سے ہے؟ وضاحت فرمائیے۔

سوال ۱۸: آیا اس دُنیا میں کوئی ایسا فرد یا کوئی گروہ ہو سکتا ہے جو خدا سے دشمنی رکھتا ہو؟ اگر ایسا کوئی نہیں ہے تو پھر قرآنِ حکیم میں خدا کے دشمنوں کا ذکر کیوں ہے (۹۸، ۴)؟

نوٹ: ان سوالات کے جوابات کے لئے مورخہ ۲۴ فروری

## نصیر الدین نصیر ہونزائی

۲۳۔ فروری ۱۹۸۴ء



## اشاراتی زبان — ۲

میں نے کہا: اس نے کہا

۱۔ میں نے کہا: قرآن پاک میں بہت سے عالی شان درختوں کی الگ الگ تعریف و توصیف کی گئی ہے، جن میں سے بعض اس دنیا سے متعلق ہیں اور بعض بہشت سے، اُس نے کہا: ایسا نہیں، وہ درحقیقت ایک ہی درخت ہے، لیکن چونکہ قرآن کریم علم و حکمت کی جنت ہے، اور جنت میں ہر چیز کے مختلف ظہورات ہوتے رہتے ہیں، لہذا یہی ایک درخت قد آنی بہشت میں کبھی زیتون (۲۴) کی شکل میں جلوہ نمائی کرتا ہے، کبھی شجر طور (۲۸) بن کر حامل نور نظر آتا ہے، کبھی شجرۃ طییبہ (۲۴) کی صورت میں نورانی پھل دینے لگتا ہے، کبھی درختِ انجیر (۹۵) کبھی انار (۵۶) کبھی انگور کی بیل (۱۱) کبھی سدہ (۱۳) کبھی طوبیٰ (۱۳) کبھی کھجور (۶۸) کبھی کیلا (۲۹) وغیرہ کی صورت میں ظہور پذیر ہو جاتا ہے، جیسا کہ قرآن حکیم زبانِ حکمت سے فرماتا ہے کہ حقیقت تو ایک ہی ہے، مگر اس کی مثالیں

بہت زیادہ اور گونا گون ہیں (۱۷۹، ۱۷۸)

۲۔ میں نے کہا: اللہ تعالیٰ کے سنو اسمائے صفاقی ہیں، بلکہ اس کے ہزار نام ہیں، بلکہ ایک اور روایت کے مطابق کئی ہزار اسماء ہیں، اُس نے کہا: اچھی طرح کان لگا کر سن لو، اگرچہ ظاہراً خدا تعالیٰ بہت سے نام ہیں لیکن دراصل اس کا صرف ایک ہی نام ہے، کیونکہ وہ واحد و یکساں ہے پینچ اللہ پاک کا حقیقی نام اسمِ اعظم ہے، جو ہر زمانے میں زندہ و گویندہ ہے، اس سے انبیاء و ائمہ علیہم السلام مراد ہیں، اور دوسرے لفظی نامِ علمی ظہورات بھی ہیں اور حجابات بھی، اور اگر ایسا نہ ہوتا تو قرآن مجید میں ”الاسماء الحسنیٰ“ کا تصور ہی نہ ہوتا (۱۷۸، ۱۷۷، ۱۷۶، ۱۷۵)

۳۔ میں نے کہا: قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے کہ: قیامت کے دن الروح اور فرشتے (خدا کے سامنے) صف باندھ کر کھڑے ہوں گے (۱۷۸) اُس نے پوچھا: کیا تم نے اس آیت میں یقوم (کھڑے ہوں گے) کی حکمت کو ٹھیک طرح سے سمجھ لیا ہے؟ آیا تم صف باندھنے کا مطلب بھی جانتے ہو؟ کیونکہ کھڑے ہونے سے انبعاث مراد ہے، اور یہ واقعہ مقامِ عقل پر پیش آتا ہے، اور صف باندھنے کے معنی ہیں منظم و متحد ہونا ایک ہو جانا، یہ عالم شخصی کی بات ہے، کہ عالمِ صغیر کی روح اور جملہ ملائکہ نورِ عقل کی ہمہ گیر نمائندگی میں ایک ہو جاتے ہیں، دیکھو صف باندھنے کی تشبیہ و تمثیل سیسہ پلائی ہوئی دیوار سے دی گئی ہے (۱۷۷) ظاہر ہے کہ ایسی دیوار کسی درز و شکاف کے بغیر کئی وحدت و سالمیت رکھتی ہے،

دوسری مثال پرندوں کے پر کھولنے سے دی گئی ہے، تم دیکھتے ہو کہ پرندے سے پر  
بُدا نہیں ہوتے (۱۹/۶)

۴۔ میں نے کہا: قرآن مقدس میں یہ بھی ہے: اور تمہارا پروردگار اور  
فرشتے صفت در صفا آئیں گے (۱۹/۶۲) اُس نے کہا: خوب یاد رکھو کہ ظاہر  
میں آتا جانا جسم کی صفت ہے، اور خداوند تعالیٰ ہر جسمانی صفت سے پاک  
برتر ہے، چنانچہ یہ ارشاد نورِ عقل کے بارے میں ہے، جو اپنے ظہوراتِ عقلی  
میں نہ صرف فرشتوں کی نمائندگی کرتا ہے بلکہ ربِّ عزت کا بھی منظر ہے۔

۵۔ میں نے کہا: قرآن حکیم میں ارشاد ہے کہ: پھر جب (روزِ قیامت)  
آسمان پھٹ کر تیل کی طرح لال ہو جائے گا (۳۵/۵۵) اُس نے کہا: ہاں، مگر تم  
نے یہ نہیں سوچا ہے کہ اُس موقع پر آسمان صاف ہو گا یا ابر اُود؟ اور حق  
بات تو یہ ہے کہ یہ واقعہ بادلوں کے اوٹ کے سچھے ہو گا، لہذا لوگ اُس  
سے بے خبر رہیں گے، یعنی یہ دراصل رُوحانیت کا قصہ ہے، جیسا کہ  
فرمایا گیا ہے: اور جس دن آسمان بادل کے پھٹ جاتے گا اور فرشتے نازل  
کئے جائیں گے جیسا کہ نازل کرنے کا حق ہے (۲۵/۲۵)، اسی موضوع سے متعلق  
ایک اور ارشاد یہ ہے: کیا وہ لوگ اس کے منتظر ہیں کہ حق تعالیٰ اور فرشتے  
بادل کے ساتبانوں میں آئیں اور امر پورا ہو جائے (۲۰/۲۰) یاد رکھو کہ یہ  
سب عالمِ شخصی کے رُوحانی واقعات و معجزات ہیں، اور ان میں سے  
کوئی بات فرضی مثال نہیں، بلکہ حقائق ہی حقائق ہیں۔

۶۔ میں نے کہا: قرآن پاک کہتا ہے کہ: خدا تعالیٰ نے رسولوں

کے مجملہ علمی و عرفانی احوال کا احاطہ کر لیا ہے اور ہر چیز کو شمار کر رکھا ہے جیسا کہ شمار کرنا چاہتے (۲۸) اُس نے کہا: یہ کام اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسانِ کامل کے عالمِ شخصی میں کیا ہے، کیونکہ لوحِ محفوظ وہیں ہے، جان لو کہ احاطہ کرنا یعنی گھیرنا اس معنی میں ہے کہ خدائے علیم و حکیم نے حضراتِ انبیاء علیہم السلام کے علومِ مخفی کے گرداگرد ایک مضبوط دیوار بنائی ہے، تاکہ کوئی شخص اذینِ خداوندی کے بغیر اس میں داخل نہ ہو سکے، جیسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو خدائے پاک نے علم کا شہراؤ حکمت کا گھر بنا کر اس کا دروازہ مولا علی علیہ السلام کو قرار دیا تھا، اور یہاں یہ بھی یاد رکھو کہ خدائے واحد کا تمام چیزوں کو شمار کرنا یہ ہے کہ اُس حکمت والے نے مجملہ اشیاء کو عدد و احد میں سما دیا ہے، اور ایسا عدد جو ایک ہے مگر سب ہے، وہ نُورِ عقل ہے۔

۷۔ میں نے کہا: قرآنِ مقدس میں پانچ بار لفظ اَدَاٰكِ استعمال ہوا ہے، اُس میں سے ایک سورۃ یاسین (۵۶) میں اس طرح ہے :-  
 هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِي ظُلُمٍ اَلِيٍّ اَلَا رَاٰكِ مُتَلَاوِنٍ (۳۶)  
 وہ اپنی بیویوں کے ساتھ چھاؤں میں تکیے لگاتے تختوں پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ اُس نے کہا: شاید تم اہلِ جنت کو الگ الگ تختوں پر سمجھتے ہو، اس لئے کہ تم اب تک اسرارِ وحدت سے ناواقف ہو، یاد رکھو کہ بہشت قانونِ وحدت کے تحت ہے، لہذا وہاں سب کے سب ایک ہو جاتے ہیں، اور ان کے تحت بھی ایک ہو جاتے ہیں، مگر ہاں لا تعدد

علمی و عرفانی ظہورات ہوا کرتے ہیں، دوسری طرح سے بھی یہ سوچنا چاہیے کہ جب چہرہ خدا میں سب لوگ فنا ہو جائیں گے  $\frac{55}{28-24}$  تو اس حال میں سب ایک ہو جائیں گے، اور ظہورات میں ہر ایک کی انفرادیت قائم رہے گی جس طرح اس دنیا میں کوئی شخص ایک ہوتا ہے، اسکی جان بھی ایک کہلاتی ہے، مگر اس میں بے شمار ذرات ہوتے ہیں۔

۸۔ میں نے کہا: لفظ سریر (تخت) کی جمع سرر جو قرآن مجید میں چار

بار مذکور ہے، اس سے متعلق ایک ارشاد یہ ہے: وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِّنْ غَيْبٍ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقَابِلِيْنَ (۱۵۱)

اور ان کے دلوں میں جو کینہ تھا ہم وہ سب نکال دیں گے کہ سب بھائی بھائی کی طرح تختوں پر آمنے سامنے بیٹھا کریں گے۔ اُس نے کہا: اگر یہ شروع شروع میں یہ درست ہے کہ خدا کی وجہ سے دوستی اور خدا کی وجہ سے دشمنی کی جاتی ہے، لیکن ایمان کے درجہ تکمال پر پہنچ جانے کے بعد معلوم ہو جاتا ہے کہ ایسی دشمنی عارضی ہوا کرتی ہے، خداوند قدوس دنیا ہی سے کامل انسانوں کے قلب کو ہر قسم کی کدورت سے پاک و پاکیزہ رکھتا ہے، چنانچہ یہ ایک مجموعی تذکرہ ہے، یا یہ کہا جائے کہ یہ عوام کی نسبت سے ہے کہ خدا اہل بہشت کے دلوں سے کینہ نکال دیتا ہے، بہر کیف جب بہشت میں عداوت نہ ہوگی تو دوستی و محبت ہوگی، اور جب شدید محبت ہوگی، تو پھر وحدت ہی وحدت ہوگی، پس اس ربانی تعلیم کا اشارہ یہ ہے کہ تصورِ ازل و ابد میں تمام انسانوں کو بہشت کے مساوی تختوں یعنی تختِ یک رنگی پر بیجا قرار دیا جائے، اور ان کو آپس میں بھائی بھائی سمجھ لیا جائے، کیونکہ وہ

سب کے سب اُس مقامِ اعلیٰ پر معنوی آدم و سوا یعنی عقلِ کلّی اور نفسِ کلّی کی اولاد ہیں۔

۹۔ میں نے پوچھا: حکماً کا قول ہے کہ: لا یولد الوحدة

اذا الوحدة = وحدت صرف وحدت ہی کو جنم دیتی ہے، اس کا مطلب کیا ہے؟ ایسی وحدت کو نسبی ہے جو ایک ایکلی ہونے کے باوجود ماں باپ کی سی دوئی اختیار کر کے وحدت کو جنم دیتی ہے؟ اُس نے جواب دیا: اس کا مطلب یہ ہے کہ عقلِ کلّ اور نفسِ کلّ ایک وجہ سے ایک وحدت کا نام ہے اور دوسری وجہ سے یہ دو ہیں اور حُجّتِ بسیط، چنانچہ اس وحدت نے جو کچھ جنم دیا، وہ دراصل وحدت ہی ہے، دوسرے لفظوں میں ان والدین سے جتنے لوگ پیدا ہوتے، ان کے مجموعی وجود کے دو پہلو ہیں، یعنی وہ ظاہر کثیر ہیں اور باطناً ایک، جیسے ان کے ازلی والدین میں دونوں باتیں پائی جاتی ہیں، اور یہاں یہ بات ہمیشہ کے لئے یاد رکھو کہ انسانوں کی وحدت ازلی اور ابدی ہے، اور کثرت عارضی اور چند روزہ ہے، پس حکماً نے اپنے اس قول میں موجودات کے باطنی اور ازلی پہلو کو پیش نظر رکھا ہے۔

۱۰۔ میں نے کہا: سُورۃِ مَجْرَاتِ (۱۰۹) میں فرمایا گیا ہے: اِنَّمَا

المؤمنون اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوا بَيْنَ اِخْوَتِكُمْ (۱۰۹)

مؤمنین تو سب بھائی ہیں سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کر دیا کرو۔ اس سے صرف یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ دینی برادری فقط مسلمانوں میں

تک محدود ہے، پھر ہم کس طرح یہ بات سمجھیں کہ ہمارے انسان دینی اخوت کے رشتے میں منسلک ہیں؟ اُس نے کہا: تو یہ سے سنو، قرآن کریم کی بہت ہی آیات کریمہ زبان تتریل سے یا زبان تاویل سے کہہ رہی ہیں کہ دین اسلام عالمِ دَر میں ادیانِ عالم پر غالب آچکا ہے، اور آگے چل کر یہ واقعہ ظاہر میں بھی پیش آنے والا ہے، جیسے حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا گیا:

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا (۲۸) بے شک ہم نے تم کو ایک کھلم کھلا فتح دی۔ نیز فرمایا: (اے رسولؐ) جب خُدا کی مدد آپہنچے گی اور فتح ہو جائے گی، اور تم لوگوں کو دیکھو گے کہ فوجِ در فوجِ خُدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں (۱-۲)، یہ عالمِ دَر میں دینِ خُدا کی فتح کی مثال ہے، اسی طرح سب لوگ پہلے تو در بے رُوح میں ناطق<sup>۳</sup> اور اساس کے رُوحی فرزند ہوں گے، اور اس کے بعد مرتبہ عقل میں عقلِ کُل اور نفسِ کُل کے عقلی فرزند قرار پائیں گے۔

|| اور میں نے سوال کیا: قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَإِذَا النُّونُ آتَاكَ فَخُذْهُ مَعَا ضِبًّا (۸۷) اور مچھلی والے رہنمائی یعنی یونسؑ کو یاد کرو، جبکہ وہ نفا ہو کر چل دیئے۔ نیز دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ن وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ (۶۸) قسم ہے دوات کی اور قلم کی اور اُس چیز کی جو لکھتے ہیں پہلی آیت میں نون مچھلی کا نام ہے اور دوسری آیت میں نون دوات ہے، ان دونوں چیزوں کے درمیان کیا تاویلی ربط و رشتہ ہے؟ اُس نے جواب دیا: حضرت یونس علیہ السلام کو جس مچھلی

تے نکل لیا تھا وہ آپ کی رُوہانیت کی ایک زیر دست رُوح تھی اور نون جہاں دوات ہے، جس کی خُدا قسم کھاتا ہے، اس سے نفسِ کُلّی مراد ہے، جبکہ قلم کا مطلب عقلِ کُلّی ہے، اور یہ بھی یاد رکھو کہ جہاں نفسِ کُلّی کی مثال مچھلی ہے وہاں عقلِ کُلّی کی تشبیہ سمندر ہے، کیونکہ مجملہ کائناتِ ظاہر بجز رُوح میں غرق ہے، اور یہ سمندر یعنی رُوحِ اعظم تفریقِ بحرِ علم ہے، اور علم سے برتر و بیرون کوئی شئی نہیں۔

۱۲۔ میں نے کہا: جس طرح اہلِ بہشت کے لئے تختوں کے معنی میں سرور اور اَرَائِک جیسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں، آیا اسی طرح لفظ عرش بھی ان کے لئے استعمال ہوا ہے، یا یہ صرف حضرت رحمان کے لئے خاص ہے؟ اُس نے کہا: عرش جہاں لغوی معنی میں ہے، وہ عام ہے، اور جہاں اصطلاحی معنی میں ہے، وہاں یہ خاص ہے، تم سورۃ نمل (۲۴) میں دیکھو کہ ملکہ سبأ کا عرش (تخت) عام ہے، اور سورۃ طہ (۲۰) میں دیکھو یہ خاص ہے، تاہم عرش اصطلاحی معنی میں بھی بطریقِ حکمت اہلِ جنت کے لئے مستعمل ہے، جس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں :-

(الف) عرش سب سے بلند ترین مثال ہے (۶۰/۱۶) وہ دنیا کی کسی مادی شئی کی طرح بیٹھنے کی چیز نہیں، بلکہ دیکھنے کی چیز ہے، یعنی وہ نورِ عقل ہے جس کا اہلِ بہشت انتہائی شوق سے مشاہدہ کرتے ہیں۔

(ب) جو لوگ چہرہ خُدا میں فنا ہو جاتے ہیں، ان کے لئے عرش

اپنے تمام معنوں کے ساتھ استعمال ہو جاتا ہے۔

(ج) عرش نور ہے اس لئے جہاں نورِ مومنین و مومنات کے



اُگے اور دانتیں چلتا ہے وہاں وہ عرش سے وابستہ ہیں (۱۲) <sup>۵۷</sup>

(د:) ہر مومن اور مومنہ کا عقلی جہنم عرشِ اعلیٰ پر ہوتا ہے، یاد رکھو کہ انبعاث ہی عقلی جہنم ہے۔

(ھ:) جس کو معرفت کے بھیدوں سے خُدا اہل جاتا ہے اس کو عرش بھی مل جاتا ہے۔

(و:) عرش و کرسی جیسا کہ ذکر ہوا، انسان کے عقلی والدین ہیں، لہذا ان کی گود میں پلنا لازمی ہے۔

(ز:) عرشِ عالم وحدت کا نام ہے، جہاں سب لوگ عقلی صورت میں ایک ہیں۔

(ح:) ہر عالم شخصی میں ایک عرش (تخت) اور روحانی سلطنت ہے۔

(ط:) بندۂ مومن کا قلب عرشِ الہی ہے، یعنی امام زمان صلوات اللہ علیہ، جو مومن کا حقیقی دل ہے، جس سے مومنین وابستہ ہیں۔

(ی:) خُدا کا گھر اور خُدا کا تخت ایک ہی معنی میں ہیں، پس جو لوگ خاتمۂ خُدا میں داخل ہیں، ان کی اناتے علوی یقیناً عرشِ اعلیٰ پر ہے۔

بندۂ مکرمین

فصیر الدین نصیر ہونزاقی

## سُورَةُ مَكْرَهٍ (۱-۹)

(ترجمہ) ہلاکت ہے ہر اس شخص کے لئے جو دُمنہ (دُمنہ) طعن اور دبیٹھ پیچھے، بُرائی کرتا ہے، جس نے کچھ مال جمع کیا اور گن گن کر رکھا، وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا، ہرگز نہیں، وہ شخص تو ریزہ ریزہ کرنے والی جگہ میں پھینک دیا جاتے گا، اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ ریزہ ریزہ کرنے والی جگہ؟ اللہ کی آگ، خوب بھڑکاتی ہوتی، جو دلوں تک پہنچے گی۔ وہ اُن پر ڈھانک کر بند کر دی جاتے گی (اس حالت میں کہ وہ) لمبے لمبے تنوں میں کھڑے ہوں گے۔

**تاویلی حکمت:** ہر ایسے شخص کے لئے رُوحانی ہلاکت ہے

جو بہالت و نادانی اور کُور باطنی کی وجہ سے ہادی برحق پر طعن اور بُرائی کرتا ہے، جس نے کچھ مال جمع کیا، یعنی کچھ ظاہری علم حاصل کیا جو بہت قلیل ہے، جس کو وہ بہت زیادہ شمار کرتا ہے، یعنی اس کے نزدیک یہ محدود علم بے شمار ہے، جس کے سبب سے اس کو گھمنڈ ہو گیا ہے، وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا یہ علم ہمیشہ کار آمد ثابت ہوگا، ہرگز ایسا نہیں، وہ آدمی تو ریزہ ریزہ

کر دینے والی جگہ میں پھینک دیا جائے گا، یعنی داعی کے عالم شخصی میں جہاں درجہ بدرجہ ذرات ہیں، جہاں نور بھی ہے اور نار بھی، علم بھی ہے اور جہالت بھی، اور سب سے بڑا عذاب عقلی عذاب ہے جو جہالت و نادانی کی صورت میں دل کو جلاتا رہتا ہے، پس وہ ۱۹ ستونوں میں گھرے ہوئے ہوں گے (۳۷/۴) جیسا کہ ارشاد ہوا ہے :-

انیس کارکن دوزخ پر مقرر ہیں، ہم نے اس کے یہ کارکن فرشتے بنا دیے ہیں، اور انکی تعداد کو کافروں کے لئے آزمائش بنایا ہے، تاکہ اہل کتاب کو یقین آجائے اور ایمان والوں کے ایمان میں اضافہ ہو (۳۰-۳۱/۴) مذکورہ ۱۹ فرشتے :

(الف:) صاحبانِ دُور بزرگ ۷ + اُن کے جُجَّان جنائز

۱۹ = ۱۲

(ب) چھوٹے دُور کے اُتمہ ۷ + جنائز کے مُجَّت ۱۲ = ۱۹ (ملاحظہ

ہو کتابِ وجہ دین، کلام ۱۷۱)

ذراتِ ارواح کس طرح حدودِ دین سے وابستہ رہتے ہیں، اس کے بارے میں ایک کلیدی حکمت سورۃ یاسین (۳۶) میں ہے، اور وہ ارشاد یہ ہے: اور ایک نشانی ان کے لئے یہ ہے کہ ہم نے ان کے ذراتِ (ارواح) کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا، اور ہم نے ان کے لئے ویسی ہی کشتیاں پیدا کیں جن پر یہ سوار ہوتے ہیں (۳۱-۳۲/۳۶) اس سے ظاہر ہے کہ تمام ذراتِ ارواح کشتیِ نوحؑ میں سوار تھے، یہ کشتی رُوحانیت کی

ہوا کرتی ہے اور ہمیشہ امام برہنہ اور آپ کے حدود کی رُوحانیت سے بنائی جاتی ہے، جس سے لوگ شعوری یا غیر شعوری حالت میں وابستہ رہتے ہیں۔

آپ اس قرآنی منطق میں خوب غور کریں کہ تمام چیزوں پر خزاہن الہی محیط ہیں، اور کوئی شیء ان خزانوں سے باہر نہیں (۱۵/۲۱)، تو پھر بہشت اور دوزخ کو خدا کی اس بادشاہی سے باہر کہاں ہونا چاہیے؟ کوئی حکومت جتنی ترقی یافتہ ہوتی ہے، اس کا جیل (JAIL) اتنا منظم ہوتا ہے، ہر جیلد کہ مجرموں کے لئے وہ بُری جگہ ہے، لیکن اصلاح معاشرہ کے لئے اس کی بڑی ضرورت ہوتی ہے، چنانچہ قید خانہ لوگوں کے وطن عزیز کے اندر ہوتا ہے، باہر نہیں۔

نصیر الدین نصیر ہونزائی

۲۵۔ نومبر ۱۹۸۴ء

# گُلہائے دانش

خانہء حکمت اور اِرادۃ عارف کے جملہ جہاں نشاوں کے نام پر، جو شرق و غرب میں رہتے ہیں، خداوندِ عالم اپنی خاص رحمتوں اور برکتوں سے ان عزیزوں کو نوازے!

یہ عاجز بندہ انتہائی عاجزی اور خلوص سے یا علی مدد کی حکمت اُگین دُعا کرتا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ خواہش یہ بھی ہے کہ یہی پاک و پاکیزہ دُعا آفاق و انفس کے تمام ذرات سے گونج اُٹھے، تاکہ گوشِ ہوش کو رازِ رُوحانیت کی خبر ہو، اور ابوابِ عرفان یکے بعد دیگرے کھلتے جاتیں۔

اے ہر عزیز کو یہ پر حکمت اخلاقی اصول ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ حُسنِ عمل کی سب سے بڑی طاقت عاجزی اور فروتنی میں پوشیدہ ہوا کرتی ہے، جیسا کہ قرآن حکیم کا ارشاد ہے: وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا (۱۳۱) اور لوگوں سے اچھی طرح بات کرو۔ اس صُحکم میں گفتگو کی تمام تر خوبیوں کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، کیونکہ خدا تعالیٰ کا ہر فرمان تمام متعلقہ معنوں پر

محیط ہوتا ہے، پس اس ربّانی تعلیم میں لوگوں سے بات چیت کرنے کی ظاہری خوبیوں کے علاوہ باطنی خوبیاں بھی مقصود ہیں۔

۲۔ آپ اپنی ذات میں یا کسی دوسرے مومن میں اللہ تعالیٰ کے اس حکیمانہ انعام کے اشارے پر بخوبی غور کر سکتے ہیں جو کسی عمدہ سے عمدہ عباد کے بعد رقتِ قلبی اور عاجزی کی صورت میں مل جاتا ہے، قانونِ فطرت کا یہ اشارہ نورِ ہدایت کی جانب سے ایک عقلی معجزہ ہے، جو زبانِ حال سے یہ کہتا ہے کہ تم اسی شاہراہِ مستقیم پر ثابت قدم رہو، اور اسی روحانی لذت و شادمانی کو اپناتے رہو جو ہر وقت کسبِ نفسی اور تواضع سے ملتی رہتی ہے۔

۳۔ ارشادِ نبوی ہے کہ: **إِنَّ مِنَ الشَّعْرِ لِحِكْمَةً يَشِيكُ** بعض نظمیں حکمت ہوا کرتی ہیں۔ یعنی جن کا نظریہ صحیح نہ ہو ان کی شاعری بے مغز، اخروٹ کی طرح ہوتی ہے، اور جن لوگوں کا عقیدہ حقیقت پر مبنی ہو، ان کے اشعار علم و حکمت کے مغز سے بھر پور ہوا کرتے ہیں، اس لئے کہ وہ حق و حقیقت کی نمائندگی و ترجمانی کرتے ہیں۔

۴۔ قرآنِ کریم (۱۶/۹) میں قلبی دوستی (وَلِيَجَّةً) کا ذکر آیا ہے، جو خدا، رسول، امامِ زمان، اور مومنین کے لئے خاص ہے، ولیجہ کا مادہ "ولج" ہے، جس کا مصدر وُلُوج (داخل ہونا) ہے چنانچہ اس لفظ (وَلِيَجَّةً) کی تاویل ہے خدا، پیغمبر اور امام کے نور اور مومنوں کی روح کو دل میں داخل کر لینا اور حقیقی معنوں میں اپنائے رکھنا، اس آیتِ کریمہ میں

امام عالی مقامؑ کا ذکر جمیل دو طرح سے فرمایا گیا ہے: خلیفہ رسولؐ کی مرتبت میں اور امیر المؤمنین کی حیثیت سے، کیونکہ منصبِ جلیلہ نبوت کا لازمہ خلافت (امامت) ہے، اور لفظ ”موہنین“ میں ہمیشہ سردارِ مؤمنین ساتھ ہے۔

۵۔ حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ کا ارشادِ گرامی ہے: ”اسماعیلی عقیدہ نور کی طرح ہے، تم نور جیسے بن جاؤ، آگ کی مثال نہ بنو، ایک اسماعیلی کے لئے مناسب نہیں کہ وہ کسی شخص سے دشمنی کرے یہاں تک کہ تم غیر مسلم کا بھی (نخواہ مخواہ) دشمن نہ ہو جاؤ“ اسماعیلی مذہب کی بے مثال رواداری اور وسعتِ قلبی کا یہ عالم ہے، تاہم امام عالی مقامؑ کی اس نورانی ہدایت سے مذکورہ بالا آیت کی تاویل متاثر نہیں ہوتی، کیونکہ دوستی کے دو درجے ہیں: ایک ہے انسانی رُوح میں دوستی، اور دوسرے مذہبی رُوح میں دوستی۔

۶۔ اہل ایمان کی سب سے بلند ترین صفت تقویٰ یعنی خوفِ خدا ہے، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی نظر میں سب سے بڑھ کر متقی ہے وہی سب سے بڑا معزز ہے (۲۹/۱۳)، مگر یہ تقویٰ جو آسمانِ معیار کے مطابق ہے علمِ لدنی پر مبنی ہے (۲۵/۲۸) اور یہ مرتبہ اعلیٰ سب سے پہلے سردارِ انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پھر امامِ برحقؑ کو حاصل ہے، اور اسی وسیلے سے سب فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

۷۔ سورۃ نور (۲۴/۵۵) میں اللہ تعالیٰ نے کامل ایمان والوں سے جس خلافتِ ارضی کا وعدہ فرمایا ہے، اور جیسی اس کی مثال زمانہء ماضی سے دی گئی ہے، وہ دراصل عالمِ شخصی کی خلافت ہے، جس میں یہ ممکن اور بڑی گنجائش ہے کہ

اہل بہشت کی طرح ہر مومن اپنے انفرادی عالم میں خلیفہ ہو، اور کوئی شک نہیں کہ اسی مقصد کے پیش نظر ہر شخص کی ذات میں ایک کائنات پوشیدہ رکھی ہوتی ہے۔

۸۔ یہ کیوں ایسا ہے کہ خلافت کبریٰ اور خلافت صغریٰ کا تعلق آسمان سے

نہیں بلکہ زمین سے ہے؟ اس لئے کہ اس منصبِ جلیلہ کا مقصد لوگوں کی اصلاح ہے، اور لوگ زمین پر رہتے ہیں، تاہم خلیفہ خدا کے لئے فرشتوں کی اطاعت (سجود) کرنے میں بڑی حکمت پوشیدہ ہے کہ ملائکہ گویا آسمانی مخلوق ہیں اس معنی میں خلیفہ خدا کو آسمان بھی مستحق ہے (۳۱۰)

۹۔ بڑی خلافت کے تحت زمین ظاہر اور زمین باطن دونوں آتی

ہیں، اور یہ مرتبہ انبیاء و ائمہ علیہم السلام کے لئے مخصوص ہے، اور چھوٹی خلافت کے تحت صرف باطنی زمین آتی ہے، جس کا دوسرا نام عالم صغیر یا عالم شخصی ہے، تاہم اس پوشیدہ دنیا میں وہ سب کچھ ہے، جو دنیا سے ظاہر میں ہے، کیونکہ یہ اس مادی کائنات کی لطیف روحانی صورت ہے، جیسے ایک قرآنی آیت کا مفہوم ہے کہ آسمان (کائنات) کے کشیف چھلکے کو اُتار کر لطیف صورت میں پیش کیا جائے گا (۸۱)

۱۰۔ خالق برحق نے جتنی دُنیا تیں پیدا کی ہیں، اُن سب میں بہترین

دُنیا عالم شخصی ہے، جس کو قرآن حکیم نے ”۲ حسین تقویم“ کا خطاب (TITLE) دیا ہے (۹۵) اور انسانوں کو عالمین (دُنیا تیں) کہا ہے، اس کا یہ مطلب ظاہر ہے کہ ہر شخص اپنی ذات میں بحد قوت ایک کائنات ہے مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کثرت سے دُنیا تیں کیوں ہیں؟ اس کا جواب



یہ ہے کہ بشرط اطاعت ہر شخص کو بہشت کی ایک سلطنت دینے کے لئے یہ اہتمام فرمایا گیا ہے۔

۱۱۔ قرآنِ مقدس میں جہاں سے جہاں تک اصنام پرستی (بت پرستی) کا موضوع پھیلا ہوا ہے اس میں یہ جان لینا ضروری ہے کہ بُتِ ظاہری اور باطنی دو قسم کے ہوا کرتے ہیں، چنانچہ دُنیا میں اکثر لوگ ایسے ہیں، جو دوسروں کی بُت پرستی پر طنز و تشنیع تو کرتے رہتے ہیں مگر اپنی بُت پرستی کو نہیں سمجھتے۔

۱۲۔ انسان کا حقیقی دل اہمِ عالی مقام ہے، جس کو قرآن حکیم نے قلبِ سلیم (۲۶، ۲۹)، اور قلبِ مُنیب (۳۳)، کہا ہے، یہی حقیقت انانے علوی بھی ہے، یعنی وہ دل جو خدا کو سونپا گیا ہے اور رُجوع کیا گیا ہے، اب اگر آدمی اور اس کے دل کے درمیان کوئی بڑی آزمائشِ حائل ہوگئی ہے، تو اس میں کامیاب ہو کر اپنے قلب تک پہنچ جانے کے لئے علم و عمل کی سخت ضرورت ہے۔

۱۳۔ قرآنِ حکمتِ آگین کا ارشاد ہے کہ شیطان کو کام کرنے کی جو مہلت دی گئی ہے، وہ کسی کی انفرادی قیامت میں منزلِ انبعاث تک ہے، اور ایک حدیثِ شریف سے اس حقیقت کی تصدیق ہو جاتی ہے، کہ ہر شخص کا ایک انفرادی شیطان ہوا کرتا ہے، اور حضور اکرمؐ کا شیطان ختم ہو گیا تھا، یعنی آنحضرتؐ کے انبعاث کی وجہ سے شیطان کی مہلت ختم ہوتی تھی، اور وہ مسلمان بن گیا تھا، اب اس میں سب سے بڑا دلچسپ سوال یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ کیوں ایسا ہے؟ اور اس میں راز کی بات کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شیطان کی شکست حقیقی علم میں ہے، چنانچہ جوں جوں علم و حکمت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے،

تو توں شیطان کمزور ہوتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ انبعاث کا وقت آتا ہے اور اس کی مہلت بالکل ختم ہو جاتی ہے۔

۱۴۔ یہ کہنا عجیب ہے کہ شیطان کے پاس بہت علم تھا، کیونکہ اگر اس کے پاس حقیقی علم ہوتا تو وہ ہرگز گمراہ نہ ہوتا، مگر ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اس نے بہت بندگی کی ہو اور علم کے نام سے بہت سی باتیں بغیر کسی حقیقت کے جانتا ہو جیسا کہ قرآن حکیم کی ایک آیت مبارکہ کا مفہوم ہے کہ: انسی اور جنتی شیاطین سوائے ایسی باتوں کے جو اندر سے خالی تھیں اور اُوپر سے طمع کی ہوتی ہیں کچھ نہیں جانتے ہیں (۱۱۲/۶)

۱۵۔ قرآن پاک کے معروف ناموں میں سے ایک نام ”ذکر“ ہے (۵۰/۶۱) اور پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک بابرکت نام بھی ذکر ہے (۱۰-۱۱/۶۵) او آپ جانتے ہیں کہ ذکر کے معنی یادِ خدا کے بھی ہیں اور نصیحت کے بھی، چنانچہ جو لوگ قرآنی علم کو حاصل کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف اللہ کی یاد کرنے اور نصیحت سُننے کا ثواب پاتے ہیں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کو رسول اور اہل ذکر یعنی ائمہ کی ہمنشینی کا ثواب بھی مل جاتا ہے

۱۶۔ عبادت و بندگی کے کئی پہلو ہیں، بالفاظِ دیگر اللہ جل شانہ کی غلامی کی بہت سی صورتیں ہیں، ان میں قرآنی علم کی خدمت ایک افضل و اعلیٰ عبادت ہے، جبکہ قرآن اسلام و ایمان کی اصل و اساس ہے، اور جبکہ قرآن خداوند تعالیٰ کی آخری پیاری کتاب ہے۔

۱۷۔ سورۃ نمل میں فرمایا گیا ہے: اور جب قولِ قیامت اُن پر واقع

ہوگا تو ہم ان کے لئے زمین (یعنی ارضِ رُوحانیت) سے ایک جانور نکالیں گے جو ان سے باتیں کرے گا کہ لوگ ہماری (یعنی اللہ کی) نشانیوں پر یقین نہ لاتے تھے (۲۴/۸۲) دابۃ الارض سے مولا علیؑ علیہ السلام کی وہ مرتبت مُراد ہے جو وقت آنے پر بصورتِ ذراتِ رُوح بولنے لگتی ہے، اور خدا کی نشانیوں کے معنی ہیں ائمہء طاہرین علیہم السلام۔

۱۸۔ آپ کو اس بات کا علم ہے کہ بموجبِ حدیثِ سفینۃ نوح اہل بیت رسولؐ کی مثال ہے، سو آیتے ہم اس کی مرئوس حکمت قرآن حکیم میں دیکھتے ہیں ارنیاد ہے: پھر ہم نے نوحؑ اور کشتی والوں کو بچا لیا اور ہم نے اس (یعنی کشتی) کو دُتیا والوں کے واسطے ایک نشانی بنایا (۲۹/۱۵) متعلقہ حدیثِ شریف کی روشنی میں اس آیتِ کریمہ کے اشارے یہ ہیں کہ کسی بھی صورت میں ہمیشہ طوفان برپا ہوتا رہتا ہے، جس سے لوگوں کے بچ جانے کا وسیلہ پیغمبرِ برحق کے اہل بیت ہیں، اور خداوندِ عالم نے اس وسیلہ نجات کو ایک مستقل آیت کے طور پر قائم رکھا ہے، تاکہ دینِ اسلام کے وسائل میں کوئی کمی واقع نہ ہو، کیونکہ دینِ فطرتِ کامل اور مکمل ہے، اور اللہ تعالیٰ کی نعمت بدرجہ تمام وکمال موجود ہے (۵/۳)

۱۹۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ایک پُر حکمت دعا اس طرح کی :-  
 رَبِّ اغْمِرْنِي وَلِوَالِدِيْ وَلِمَنْ حَتَلْ بِيْتِيْ مُوْمِنًا  
 وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ (۲۸/۱) اے میرے رب مجھ کو میرے  
 ماں باپ کو بخشدے اور جو (خاص) مومن ہو کر میرے (اہل بیت) میں داخل

ہیں انکو اور (عام) مومنین اور مومنات کو بھی۔ اس آیتِ مبارکہ میں سب سے بڑی حکمت یہ ہے کہ جس طرح حضرت نوحؑ کے اہل بیت سے ایک فرد نافرمان ہو کر خارج ہو گیا تھا، اسی طرح کئی افراد حقیقی فرمانبرداری سے آپؐ کے اہل بیت میں داخل و شامل ہو گئے تھے۔

۲۰۔ انبیاء و ائمہ علیہم السلام کے گھر سے ان کی روحانیت نورانیت مراد ہے، جس میں مومنین کا آج یا کل داخل ہونا لازمی ہے، ورنہ جسمانی حالت میں ہادی برحق کے گھر میں اہل ایمان کا داخل ہو جانا ضروری نہیں، پس یہی وجہ ہے کہ زمانہ نبوت کے اہل بیت محمدؐ رسول اللہؐ، علیؑ مرتضیٰ، فاطمہؑ زہرا، اور حسنؑین صلوات اللہ علیہم تھے اور سلمان فارسی کی مثال سے یقین آتا ہے کہ اور بھی کئی مومنین خانہ نور میں داخل ہو گئے تھے اگرچہ ان کے نام ظاہر نہیں، کیونکہ امام اسی مقصد کے لئے دین کا زندہ راستہ یعنی صراطِ مستقیم بھی ہے، راہنما بھی ہے، اور شہرِ روحانیت کا دروازہ بھی، تاکہ مومنین کو منزل مقصود تک پہنچا دیا جاتے۔

۲۱۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے کہ: جو شخص نیک کام کرے گا اس کو دس گنا بدلہ ملے گا (۱۶۰)، یعنی جو اس دنیا میں ایک نیکی کرے، اس کو آخرت میں دس نیکیاں ملیں گی، اس کی تاویلی حکمت یہ ہے کہ جو شخص دعوتِ حق کو قبول کرے مستحب بن جاتا ہے، تو وہ ایک بہت بڑی نیکی کرتا ہے لہذا اسے دس حصہ نیکی ملے گی، جو اس طرح ہے: مستحب، ماذون اصغر، ماذون اکبر، داعی مکتوف، داعی مطلق، حجتِ بنزیرہ، حجتِ اعظم، امام،

اسائن، اور ناطق، یہ نیکی کے وہ دس درجات ہیں، جو تمام نیکیوں پر محیط ہیں۔  
 ۲۲۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں کسی کام کے لئے مُکھم دیا گیا ہے، اس  
 کا اطلاق عمل کے ادنیٰ اور اعلیٰ تمام مدارج پر ہوتا ہے، مثال کے طور پر الگ  
 الگ آیتوں میں ۲۷ بار **وَاعْلَمُوا** (اور جان لو) فرمایا گیا ہے، جس کا  
 مقصد صرف یہی نہیں کہ لوگ دنیا میں علم کو حاصل کرتے رہیں، بلکہ آخرت میں  
 بھی علم سے وابستہ رہنا ہے، جیسے ارشاد ہوا ہے: **وَاعْلَمُوا أَنَّ**  
**اللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ وَأَنْتَ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ**  
 (۲۴) اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ آڑ بن جایا کرتا ہے آدمی اور اس کے قلب  
 کے درمیان اور بلاشبہ تم سب کو اس کے پاس جمع ہو جاتا ہے پس اس  
 امر کا منشا یہ ہے کہ ذاتِ انسانی سے متعلق علم و معرفت کو بدرجہ تمام  
 و کمال حاصل کیا جائے، تاکہ یہ راز معلوم ہو سکے کہ کس طرح خدا بندۂ  
 مومن اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے؟ **الحمد لله رب العالمين**

بندۂ غریب

فصیر الدین نصیر ہونزائی

۵۔ نومبر ۱۹۸۴ء

# دو انتہائی عظیم فرشتے

ترجمہ از

دیوان پیر ناصر خسرو قاسمی

مطلع: بالای ہفت چرخ مدور دو گوہرند

۱: ان سات گول آسمانوں کے اوپر دو گوہر ہیں، جو حقائق آسمان سے اوپر  
یا باہر ہیں وہ ازلی، ابدی اور لامکان ہیں جن کے نور سے عالم اور انسان متور اور درخشا  
ہیں۔

۲: یہ دونوں خود تو شکل و صورت سے برتر ہیں، مگر تصویر بنانے  
والے ہیں اور نیستی کی بجگہ دانی میں ہستی کے لطف سے تصویر بنا دیتے ہیں۔  
۳: وہ ان چیزوں میں سے نہیں جو محسوسات کہلاتی ہیں، وہ  
سو اس میں نہیں سماتے، اور نظر نہیں آتے، کیونکہ وہ نہ تو تاریک ہیں  
اور نہ ہی روشن۔

۴: یہ قدیم یعنی ازل کی بات ہے کہ وہ دائیہ قدس کے پروردہ  
ہیں۔ وہ گوہر نہیں اگرچہ اوصاف گوہر رکھتے ہیں۔

۵: آفرینش کی اس جانب سے بھی اور کائنات کی اس طرف  
یعنی لامکان سے بھی، حدودِ زمان میں بھی اور لازمان میں بھی وہ ساتھ

رہتے ہیں۔

۶: وہ ایک اعتبار سے اس جہاں میں نہیں ہیں اور دوسرے اعتبار سے اس میں موجود ہیں، وہ ہم میں غیر موجود بھی ہیں اور ہمارے بدن میں رُوح پرور بھی۔

۷: کہتے ہیں کہ اپنی معنوں میں وہ دونوں گوہر دونوں جہاں کی حیثیت سے ہیں، اسی طرح وہ سات اقلیم میں حاضر بھی ہیں اور غائب بھی، یعنی دُنیا ہونے کی مرتبت میں عیان اور آخرت ہونے کی مرتبت میں نہاں ہیں۔  
۸: ان میں سے ایک رُوح قدسی کا درجہ رکھتا ہے اور دوسرا برائیل کی ذات ہے، یعنی یہ دونوں پرواز کرنے والے فرشتے ہیں مگر مادّی قسم کے پر نہیں رکھتے۔

۹: تعجب ہے کہ یہ دونوں فرشتے عالم سفلی میں پروں کے بغیر پر کھولے بیٹھے ہیں، اور بازوؤں کے بغیر عالم علوی پر اڑ جاتے ہیں۔

۱۰: دُنیا کے عناصر اربعہ جو گرم، سرد، خشک اور تر ہیں، یعنی مٹی، ہوا، پانی اور آگ، ان کے ساتھ وہ گوہر موافقت رکھتے ہیں۔

۱۱: گنج خانہ ازل میں اور خزینہ ابد میں یہ دونوں، جوہر گوہر موتی، نہیں، لیکن مثال کے طور جوہر کے نام سے ہیں۔

۱۲: یہ دونوں گوہر عالم بھی ہیں اور آدم بھی، دوزخ بھی ہیں اور بہشت بھی، حاضر بھی ہیں اور غائب بھی، زہر بھی ہیں اور شہد بھی۔

۱۳: اور نور سے لے کر ظلمت تک بلندی سے لے کر پستی تک،

مشرق سے لے کر مغرب تک اور سمندر سے لے کر خشکی تک یہی محیط ہیں۔

۱۴: یہ موجود بھی ہیں اور معدوم بھی، باطن بھی ہیں اور ظاہر بھی اسی سبب سے یہ تجھ سے الگ بھی ہیں اور تیرے ساتھ ایک ہی گھر میں بھی رہتے ہیں۔

۱۵: دوسرے جہان میں کہ وہ ان کا کارخانہ ہے، یہ ہر عمارت او اس کے بانی کو فنا کر ڈالتے ہیں۔

۱۶: حواسِ خمسہ اور چار طبائع یعنی، مٹی، پانی، ہوا اور آگ کے روزی دینے والے ہیں، اور نو آسمانوں اور سات ستاروں کے خالی کرنے والے ہیں، جس کا مطلب ہے زمین کی طرف گونا گوں قوتوں کا فیض بھیتے رہنا۔

۱۷: ان سے مشرق و مستفید ہونے والے دس ہیں جو ان کے دولت کردہ کے گرد اگر دبٹھے ہوتے ہیں، ان سے پانچ اندر جاسکتے ہیں اور پانچ نہیں جاسکتے، یعنی پانچ حواسِ ظاہر اور پانچ حواسِ باطن۔

۱۸: دونوں کے سامنے آسمانِ ظاہر اور آسمانِ باطن دونوں کا

نوٹ: دو گوہر سے عقلِ کل اور نفسِ کل مراد ہیں، اور دو انتہائی عظیم فرشتے یہی ہیں۔

بعض جگہوں میں آزاد ترجمہ کیا گیا ہے۔



دکاندار کھڑا ہے، اور وہ جو کچھ بتدریج فروخت کرتا ہے تو یہ اسے خرید لیتے ہیں۔  
 ۱۹: وہ بادشاہ جس کے دس سرچھ پہرے اور سات آنکھیں ہیں اور چار افراد جو ہمیشہ آپس میں جھگڑتے رہتے ہیں، یہ گوہران سب کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہتے ہیں، بادشاہ سے کائنات مراد ہے، جس کے دس سر ہیں یعنی نو آسمان اور زمین، چھ پہرے ہیں یعنی چھ اطراف، اور سات آنکھیں ہیں یعنی سات ستارے، اور چار مخالف افراد چار عناصر ہیں۔

۲۰: وہ جوہر نہیں ہیں، ان کا جوہر نغرض ہے، نوٹ: جوہر کے دو معنی ہیں: (۱) گوہر عقل، یعنی مثل اعلیٰ کا موتی (۲) وہ چیز جو بذاتِ خود قائم ہے، جیسے کاغذ کہ از خود قائم ہے، مگر تحریر کاغذ پر قائم ہے، پس کاغذ جوہر ہے اور تحریر نغرض۔ یعنی جوہر ان کی مثال کو پیش کرتا ہے، وہ اپنے آپ قائم نہیں بلکہ یہ ان دونوں پر قائم ہے، اس معنی میں یہ جوہر دراصل نغرض ہے، انھوں نے نغرض کے مدار و محور کو بنایا ہے اور وہ خود بخود نہیں ہیں۔

۲۱: یہ تجھ کو ظاہری حروف کے بغیر کتابِ اسرار پڑھ کر سناسکتے ہیں، اور دیکھے بغیر اعمال کو جانتے ہیں۔

۲۲: ان کا ظاہر ہو جانا اس لئے ہے کہ یہ دراصل باطن میں ہیں، یہ اپنا جسم اور سر نہیں رکھتے کیونکہ یہ ہر تن اور ہر سر میں ہیں۔

۲۳: یہ ان کی صفات میں سے ہے کہ کائنات میں نہیں سمجھتے، لیکن اس کے باوجود وہ دونوں ہمارے جسم و سر میں مضمر ہیں۔

۲۴: یہ مکان تیرے ہی واسطے بنایا گیا ہے، ورنہ ان کے لئے مکان کی کیا اہمیت ہے، کہ وہ تو مکان سے برتر ہیں۔

۲۵: وہ ایک ایسی جگہ سے تیری طرف آئے ہیں کہ وہ دراصل جگہ ہی نہیں بلکہ لامکان ہے، وہ وہاں فرشتے ہیں اور یہاں پیامبر ہیں۔

۲۶: وہ صفات میں درجہء ملکوت سے بالاتر ہیں، کیونکہ وہ ذات ذوالجلال کی طرح نہ عنصر ہیں اور نہ جوہر۔

۲۷: اس حقیقت کے باوجود کہ دونوں جہان ان دونوں کے زیرِ نگیں ہیں، اگر تو پچھا ہے تو یہ تیری رُوح کے تابع فرمان ہو سکتے ہیں۔

مترجم:  
نصیر الدین نصیر ہونزائی

۱۴- مارچ ۱۹۸۴ء

# موت کی عظیم حکمتیں

بھاری سے بہت ہی عزیز فرشتہ صفت بیٹی ماہِ محل پر نورِ امامت کی

شعاعیں برستی رہیں!

میں انتہائی خیر خواہی اور قلب کی گہرائی سے ”یا علیٰ مَدَدًا“ کی  
مقدس دعا کرتا ہوں، اور اس پُر حکمت دُعا میں اپنی بہت ہی پیاری بیٹی کے  
ساتھ دُعا کے جملہ عزیزوں کو بھی یاد کرتا ہوں، خُداوندِ قدّوس اُن سب کو  
نوازے! دونوں عالم کی کامیابی اور سر بلندی عنایت فرماتے!

عزیز بیٹی، بہت ہی عزیز بیٹی! ہمیں معلوم ہے، فون پر آپ کو بتایا  
گیا ہے کہ آپ کے والدِ محترم کا انتقال ہو چکا ہے،.... اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا  
اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ دہم اور ہمارا سب کچھ خدا کی ملکیت ہے اور ہم فقط  
طور پر بھی اور دائمی طور پر بھی اُسی کی طرف لوٹنے والے ہیں، یہ اس سلسلے  
میں قرآن پاک کی ایک تعلیم ہے، جس پر ہم سب کا ایمان ہے، چونکہ  
آپ اور ہم امام برحق صلوات اللہ علیہ کے علمی سپاہی ہیں، لہذا آیتے ہم  
معمولی اور رسمی باتوں کو چھوڑ کر کچھ حقیقی علم کی باتیں کریں، تاکہ اس سے

ایک طرف مرحوم کے لئے کوئی تحفہ ثواب ہو، اور دوسری طرف علمی لشکر کی معلومات میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہو سکے۔

ار موت کی بہت قسمیں ہیں، مگر سب سے عالی شان اور پر حکمت موت وہ ہے، جو خدا کے دوستوں یعنی مومنین سے متعلق ہے، انبیاء و ائمہ علیہم السلام دوستانِ خدا کے سردار ہیں، چنانچہ حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ "موت مومن کا گلہ رستہ ہے" گلہ رستہ کتنا خوبصورت اور پیارا ہوتا ہے، اس میں کیسی رنگینی اور دلکشی ہوتی ہے، اس کی خوشبو سے یکایک قلبِ بشر میں فرحت و شادمانی کی ایک لہر دوڑنے لگتی ہے، یہ تو صرف چند ظاہری اور مادی پھولوں کے مجبوسے کی بات ہوتی اور اگر ایسا کوئی گلہ رستہ نہ مڑجھانے والے لازوال اور غیر فانی پھولوں کا ہو، اور وہ محبوبِ جان کی جانب سے آئے، تو پھر مسرت و شادمانی کا ایک عجیب طوفان برپا ہوگا، یہ مومن کی موت کی مثال ہے، تاہم قانونِ حکمت کا یہ تقاضا ہے کہ جب تک روح جسم سے جدا نہیں ہوتی، تب تک کوئی بھی خوشی طوفانی قسم کی نہ ہونی چاہتی ہے، کیونکہ انسان جس طرح شدید غم کے بوجھ کو برداشت نہیں کر سکتا، اسی طرح وہ حد سے زیادہ خوشی کا بھی تحمل نہیں ہو سکتا ہے۔

۲۔ قرآن حکیم میں موت سے متعلق جو کلمہ (عام قاعدہ) ہے (۱۸۵)، اس کی روشنی میں صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ ہر وہ جان (نفس) جو اللہ کے معیار کے مطابق جان کہلاتی ہو، وہ موت کی وجہ سے معدوم یا نیست و نابود نہیں ہوتی، بلکہ وہ موت کے بہت سے تجربات

سے گزرتی ہے، کیونکہ رُوحوانی موت دراصل ایک دُنیا ہے، اس میں یقین و معرفت کے بھید ہی بھید ہیں، یہی سبب ہے کہ قرآن حکیم نے اپنی مخصوص حکمت کی زبان میں موت کو چاہنے اور دل میں اس کی آرزو پیدا کرنے کی تعلیم دی ہے، کیوں نہ ہو جبکہ یہ درسگاہِ علم و معرفت اور بہشتِ بریں کا ایک بیتا جاگتا نمونہ ہے (۲/۹۷)

۳۔ موت کی حکمتیں عظیم ہیں، جیسے سورہ ملک (۱-۲)، میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: وہ (یعنی خُدا) بہت برکت والا ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی عقلی و رُوحوانی بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون شخص عمل میں زیادہ اچھا ہے (۲/۲۷)

جیسا کہ دانشمند مومنین اس سترِ عظیم سے واقف و آگاہ ہیں کہ قرآن مُقدس میں جہاں جہاں دستِ خُدا کا ذکر فرمایا گیا ہے، وہاں ذاتِ سبحان کے اصل ہاؤرسب سے خاص خزانے کا ذکر ہوتا ہے، جیسا کہ کتاب ”گنج گراںمایہ“ میں اس حقیقت کی وضاحت کی گئی ہے۔ مینا بیچ مذکورہ بالا ارشاد میں بزبانِ حکمت یہ فرمان ہوا ہے کہ جسمانی پیدائش کے بعد رُوحوانی جہنم ہے، پھر رُوحوانی موت کا تجربہ ضروری ہے، اور آخر میں انبعاث کا مرحلہ ہے، تاکہ قبضہٴ قُدرت میں جو بادشاہی ہے اس کی برکتوں سے فیض حاصل کیا جائے۔

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ (اُس نے موت اور حیات کو پیدا

کیا، یہ انسان کی سب سے اعلیٰ موت اور سب سے پاکیزہ زندگی کا بیان ہے، وہ رُوحانی موت اور انبعاث ہے، اگر یہ جسم کی بات ہوتی تو وہ اس طرح ہوتی اُس نے حیات اور موت کو پیدا کیا، کیونکہ ظاہر ہے کہ پہلے تو جسمانی پیدائش ہے، پھر موت، نیز یہ بھی سوچنا ہے کہ جسمانی موت پر لفظِ خَلْقٌ (پیدا کیا) کا حقیقت اطلاق نہیں ہو سکتا ہے، کیونکہ یہ موت جسم سے الگ بذاتِ خود کوئی مخلوق شی نہیں محسوس ہو سکے، اس کے برعکس یہ کہنا بالکل درست اور حقیقت ہے کہ خدا تعالیٰ کے معیار کے مطابق جیتے جی انبعاث سے قبل کی زندگی موت اور مخلوق ہے، موت اس معنی میں بھی کہ حضرت عزرائیل علیہ السلام نے اس میں بار بار قبضِ رُوح کا عمل کیا۔ اور مخلوق اس لئے کہلائے کہ وہ موجود اور محسوس ہے۔

۴۔ اگرچہ ہر مومن جیتے جی رُوحانی موت کا مزہ چکھ نہیں سکتا، لیکن اس مقصد کے پیش نظر امام زمانؑ کی فساد برداری سید ضروری ہے، تاکہ اس کی رُوح کا ذرہ حدودِ دین میں سے کسی سے واصل ہو جائے (آپ اس سلسلے میں کتاب ”وجہ ۷ دین“ گفتار ۲۶ کا مطالعہ کر سکتے ہیں) ایسے افراد مومنین حدود کے وسیلے سے رُوحانی مراحل کو طے کر سکتے ہیں، جیسا کہ خداوند تعالیٰ کے کلامِ حکمت نظام میں ہے :-

وَتَحْمَلُ اثْقَالَكُمْ إِلَىٰ بَلَدٍ لَّمْ تَكُونُوا بِلْغِيهِ  
إِلَّا لِشِقِّ الْأَنْفُسِ (۱۶) اور وہ (چو پائے) تمہارے بوجھ ایسے  
شہر کو لے جاتے ہیں جہاں تم اپنی جانوں (رُوحوں) کے ذرات بناتے

بغیر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ چوپایوں سے محدود دین مراد ہیں، جن کے سہارے پر مومنین شہرِ روحانیت میں پہنچ جائیں گے، اور بہشت میں سابقہ رُوحانی سفر کی ہر ہر منزل کا مشاہدہ ہوگا۔

۵۔ جس طرح جسمانی موت سے کوئی بھاگ نہیں سکتا، اسی طرح رُوحانی موت بھی کسی نہ کسی صورت میں آنے والی ہے، جیسا کہ سورۃ نسا (۴۸) میں ہے: **ابن ما تَكُونُوا يُدْرِكُكُمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بَرٍّ أَوْ بَحْرٍ مُّشْتَدٍّ** (۸)، تم جہاں بھی ہو وہاں ہی تم کو موت آدبا دے گی، اگر یہ تم مضبوط قلعوں ہی میں ہو مضبوط قلعوں کی تاویل ہے اہم زمانہ اور آپ کے حدود، ان رُوحانی اور علمی قلعوں میں رہنے والوں پر بھی رُوحانی موت کا تجربہ گزرے گا، کیونکہ اسی میں قیامت سے متعلق سارا علم پوشیدہ ہے۔

۶۔ اس سلسلے کا ایک اور ارشاد سورۃ بقرہ (۲۳۳) میں اس طرح ہے: **اِنَّ رُوحَ رَسُوْلٍ كَيْفَ تُمْنِنُ** (۱) ان لوگوں کے (حال) پر نظر نہیں کی، جو موت کے ڈر کے مارے اپنے گھروں سے نکل بھاگے اور وہ ہزاروں آدمی تھے تو خدانے ان سے فرمایا کہ سب کے سب مر جاؤ اور وہ مر گئے پھر خدانے انہیں زندہ کیا، بے شک خدا لوگوں پر بڑا مہربان ہے، مگر اکثر لوگ اس کا شکر نہیں کرتے۔ یہ لوگ کون تھے جو ہزاروں کی تعداد میں بلکہ بے شمار تھے؟ اور اللہ نے ان سے کیوں فرمایا کہ مر جاؤ؟ یہ ذراتِ رُوح تھے جو صورِ اسرافیل کے خوف سے اشخاص کی قبر تازوں

سے نکل کر بلانے والے کی طرف جاتا ہے تھے، یہاں حدودِ دین میں سے کسی کی ذاتی قیامت اور روحانی موت واقع ہو رہی تھی، اسی کے ساتھ ساتھ ان بے شمار ذرات پر بھی حکمتِ موت آتی، اور اسی طرح اُن کا انبعاث بھی ہو گیا، مگر یہ سب کچھ غیر شعوری حالت میں تھا، اور ہاں یہ عمل بہشت میں بطریقِ روحانی عکس سامنے آتے گا۔

۷۔ سورۃ دُخان (۴۴) میں فرمایا گیا ہے: لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ (۴۴) وہ لوگ بہشت میں موت کا ذائقہ نہ چکھیں گے مگر اُس موت کے جو دنیا میں اُپھکی تھی۔ یعنی جنت میں روحانی موت نہیں، وہ تو براہِ راست یا بالواسطہ شعوری یا غیر شعوری طور پر دنیاوی زندگی میں واقع ہو چکی تھی، اب بہشت میں صرف اُس عظیم کارنامے کا نظارہ کرنا اور علمی لذت اٹھانا ہے۔

۸۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی روحانی موت کا تذکرہ اس طرح ہے پھر جب ہم نے سلیمان پر (روحانی) موت مقرر کیا تو کسی چیز نے اُن کے مرنے کا پتہ نہ بتلایا مگر گھن کے کیڑے نے کہ وہ سلیمان کے عصا کو کھاتا تھا سو جب وہ گر پڑے تب بچات کو حقیقت معلوم ہوئی کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو اس بخاری کے عذاب میں نہ رہتے (۳۴) حَابَةُ الْأَرْضِ (گھن کا کیڑا) سے کچھ رُو حیں یعنی یا بوج و ما بوج مراد ہیں، عصا کا مطلب یہاں رُو ح حیوانی ہے، کیونکہ اسی سے انسانی رُو ح کو سہارا ملتا رہتا ہے، مگر اس لامٹھی کو یا بوج و ما بوج بچاٹ لیتے ہیں، گرنے کا مطلب عملِ عزرائیل



کی خاطر لیٹ جانا ہے۔

۹۔ عالمِ شخصی کی زمین میں زندوں اور مردوں کی لاتعداد روہیں جمع ہیں سورۃٓ مرسلات میں فرمایا گیا ہے، (۲۵-۲۶) اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا اَحْيَاءَ وَاَمْوَاتًا (۲۵-۲۶) کیا ہم نے زمین کو زندوں اور مردوں کی سمیٹنے والی نہیں بنایا: ظاہری زمین پر لوگ ہر جگہ بستے ہیں، اور مردے ہر مقام پر دفنائے یا بھلتے جاتے ہیں، اس میں سمیٹنے کی کوئی بات نہیں، مگر جب انفرادی قیامت قائم ہو جاتی ہے، تو اس وقت انسانِ کامل کی شخصیت کی زمین تمام زندوں اور مردوں کی ارواح کو سمیٹ لیتی ہے۔

۱۰۔ روحانی موت دراصل رُوح کے عروج و ارتقاء کا سلسلہ ہے لہذا خدا کے دوست اس کو بہت چاہتے ہیں، جس کی دلیل اس آیت کریمہ میں موجود ہے: (اے رسول!) تم کہہ دو کہ اے یہود! اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ تم ہی خدا کے دوست ہو اور لوگ نہیں تو اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو موت کی تمنا کرو (۲۴) اس سے ظاہر ہے کہ روحانی موت کی تمنا خدا کی دوستی کی علامت ہے، کیونکہ جسمانی موت کی آرزو کوئی ایسا کافر بھی کر سکتا ہے، جو دنیا کی کسی سخت تکلیف سے تنگ آچکا ہو، اور ایسا شخص اللہ کا دوست نہیں ہو سکتا، یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ روحانی موت کی تمنا کسی بھی عنوان سے ہو سکتی ہے، جیسے روحانی ترقی، دیدارِ خداوندی، حصولِ معرفت وغیرہ کو چاہنا۔

۱۱۔ سورۃٓ انعام (۱۲۲) میں انسانِ کامل کی روحانی موت اور

حیاتِ طیبہ کا بیان اس طرح فرمایا گیا ہے: **أَوْ مَن كَانَتْ مَيِّتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَن مَّثَلَهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا** (۱۶۲/۴)

کیا جو شخص (پہلے) مُردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس کے لئے ایک نور بنایا جس کے ذریعہ سے وہ لوگوں کے عالمِ شخصی میں چلتا ہے اس شخص کا سا ہو سکتا ہے جس کی یہ حالت ہے کہ (ہر طرف سے) اندھیروں میں (پھنسا ہوا) ہے کہ وہاں سے کسی طرح نکل نہیں سکتا یہ زبانِ حکمت کی باتیں ہیں، لہذا ان کی سطح بہت بلند ہے، چنانچہ یہاں مُردہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انسانِ کامل مرحلہٴ عزرائیلی سے ہو کر آگے گزر چکا تھا، جس کو مقامِ انبعاث پر حیاتِ طیبہ میں زندہ کر کے نورِ کامل مقرر کیا گیا، وہ لوگوں کے باطن میں چل سکتا ہے، اور ایسا شخص صرف اور صرف امامِ زمان علیہ السلام ہیں، اور اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، کیونکہ لوگوں کے اندر جب مُضِلّ (گمراہ کرنے والا، یعنی شیطان) داخل ہو کر اپنا کام کر سکتا ہے، تو ہادیٰ بروحِ عاکی رسائی انسانوں کے دل و دماغ تک کیوں نہ ہو۔ والسلام۔

خاکپائے مومنان

فصیر الدین نصیر ہونزائی

